رفاقت علی شاہد *

اردو کا صحافتی ادب: تعریف، تشکیل، روایت

۱۔تعریف

تمہید

آج سے ٹھیک تیس (۳۰) برس پہلے رشید حسن خاں مرحوم نے لکھا تھا:

یہ مشہور بات ہے کہ صحافت اور اَدب میں تضاد کی نسبت ہے۔[۱]

رشید حسن خاں نے سامنے کی بات کو موثر اَدبی پیرائے میں بیان کیا ہے۔[۲] میرے اِس مضمون کا مبحث بھی کچھ اِسی طرح کا ہے۔ میں نے اَدب اور صحافت کے بظاہر متضاد تعلق میں اشتراکِ عمل کا ایک رنگ واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اُردو اَدب اور اُردو صحافت میں مشترک اقدار کے مطالعے و تجزیے سے سروکار نہیں رکھا گیا او رنہ رکھا جا رہا ہے۔ اس موضوع پر لے دے کر دو چار مضامین سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ ان میں رشید حسن خاں کا مضمون سب سے اہم ہے۔ اُن کے بعد اس موضوع پر ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کا مضمون اہم ہے۔

اُردو صحافت کی دو سو سالہ تاریخ میں ہزاروں اخبار، رسالے اور جریدے شائع ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ اس قدر کثیر و عظیم سرمائے کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے معلوم ہو گا کہ اس میں اَدبی مواد بھی اِسی اعتبار سے کثیر تعداد میں موجود ہے۔ اِس صحافتی اَدبی مواد کو کم تر نہیں جانا جا

سکتا۔ اتنی کثیر تعداد کے صحافتی اَدبی مواد کی موجودگی تقاضا کرتی ہے کہ اس کی نوعیت، تاریخ، روایت، مقدار اور اقسام پر تفصیل سے تحقیق، تجزیہ اور تنقید کی جائے۔ اس مواد کے کتابیاتی اشاریے بھی تیار ہونے باقی ہیں۔[۳] اس مقالے میں اِنھی اُمور سے متعلق تحقیقی و تعارفی مباحث پیش کیے جا رہے ہیں۔

اَدب اور صحافت

اَدب اور صحافت کی اِس بحث میں دو اُمور کی وضاحت شروع میں ہو جانی چاہیے۔ ان میں ایک ''اَدب'' اور ''صحافت'' کے بنیادی سروکار سے اور دوسرا ان کی عملی حدود کے تعین سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وضاحت کا فائدہ یہ ہے کہ متعلقہ اُمور کے بارے میں بنیادی باتیں ذہن میں رہیں گی۔ آسانی کی خاطر طویل بحثوں میں پڑنے کے بجائے میں صرف رشید حسن خاں اور ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کے بیان کردہ مباحث سے سروکار رکھوں گا۔ اَدب اور صحافت کے موضوع پر ان دونوں کے مضامین اہم ہیں، لہٰذا ان سے متعلق تصورات کی وضاحت بھی انھی کے بیانات کی روشنی میں ہونا مناسب تر ہے۔

رشید حسن خاں نے اپنے مضمون ''اَدب او رصحافت'' میں ان دونوں کے تعلق سے جو بحث کی ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اخبار میں خبریں ہوتی ہیں، وہ بھی مختصر، وقتی اور ہنگامی نوعیت کی۔ اس کے بعد ایڈیٹوریل (editorial) قدرے تفصیل سے ہوتا ہے جو کسی خاص اور متاثر کن واقعے، معاملے یا حادثے پر تحریر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کالموں، مضامین او رتخلیقی تحریروں (نظم، افسانہ، مضمون، وغیرہ) پر مشتمل تحریروں کا نمبر آتا ہے۔ ان میں سے خبروں، ایڈیٹوریل، کالموں او رغیر اَدبی مضامین، وغیرہ کا اثر کچھ کم یا زیادہ عرصے کے بعد زائل ہو جاتا ہے۔ ان کے سوا جن تحریروں میں اعلیٰ اَدبی اقدار پائی جاتی ہیں، وہی اخبار میں سے زندہ رہ جاتی ہیں، بقیہ محض اخبارات و رسائل کے دفینوں کی حیثیت سے باقی رہتی ہیں۔ اس ساری بحث کے بعد رشید حسن خاں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ یہ ہے:

> بڑا ادیب اور سچا ادیب وقتی اور ہنگامی مفاد کو مطمعِ نظر قرار نہیں دیتا۔ اس سطحیت کو وہ اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دیتا ہے جو خسارے کا سودا کرنے کے قائل نہیں ہوتے ......[۴]

اس اقتباس اور مندرجہ بالا بحث کے تناظر میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ اخبار میں خبریں، ادارتی شذرات، کالم، وغیرہ تجارتی مقاصد کی غرض سے ایک طے شدہ پالیسی کے تحت لکھے جاتے ہیں۔ ان

کے لکھنے والے عموماً ادارے کے ملازم ہوتے ہیں۔ وہ ملازم ہوں یا باقاعدہ ملازم نہ ہوں، بہرحال ادارے یا اخبار کی طے شدہ پالیسی کے تحت ہی لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اَدب آزاد رہ کر اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کو آزادانہ طور پر استعمال کر کے ہی تخلیق کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اخبار ایک کارخانہ ہے۔ اس میں رپورٹر، خبر نویس، خبریں ترتیب دینے والا/والے، مدیر، مالک، سب الگ الگ اور اپنے اپنے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے خدمات انجام دیتے ہیں۔ اخبار میں خبروں، ادارتی تحریروں، کالم، مضامین، وغیرہ کی اشاعت کے پیچھے ان سب کی کاوشیں شامل ہوتی ہیں۔ یوں خبر کے حصول سے لے کر اخبار کی اشاعت تک کے مراحل اجتماعی اور پنچایتی عمل کے ذریعے سرانجام دیے جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں:

> اَدبی تخلیق خالص شخصی اور ذاتی معاملہ ہے، اسے بھلا اس کو آپریٹو طریقِ کار اور اس تجارتی مطمحِ نظر سے کیا واسطہ! یہی وجہ ہے کہ اخبار میں کام کرنے والے کیسے ہی ہوں، مگر اس کا بیش تر حصّہ خالص صحافتی ہوتا ہے۔[۵]

اسی سلسلے میں ایک اَور پہلو کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے وہ مزید واضح کرتے ہیں کہ اخبار میں خبر سے لے کر شذرات اور کالم تک میں اخبار یا ادارے کی مخصوص پالیسی، مالک اور مدیر کے مزاج اور اُفتادِ طبع کی چھاپ موجود ہوتی ہے۔ یہ چیز ان تحریروں کو اَدب بننے سے روکتی ہے، کیونکہ ان تحریروں میں شخصیت اور طبیعت کا انفرادی رنگ اور جذبہ و احساس شامل نہیں ہوتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ:

> اصل چیز لکھنے والے کا طرزِ عمل ہے، اس کا اندازِ فکر اور اندازِ نظر۔[۶]

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے اپنے مضمون ''اَدبی صحافت اور اَدبی رویے'' میں اَدب اور صحافت سے متعلق کچھ اَور نکات پر بحث کی ہے۔ اُن کے الفاظ میں:

> خالص صحافت معلومات کی فراہمی اور اِطلاعات کی ترسیل سے علاقہ رکھتی ہے اور اَدب میں زبان کے استعمال کی نوعیت دبیز، تہ دار یا بڑی حد تک بالواسطہ اظہار کی ہو جاتی ہے ...... اخبارات کی خبریں یا فیچر کے وسیلے سے کسی خیال، نقطۂ نظر یا معلومات کو جیسے ہی قاری تک پہنچا دیا جاتا ہے، اُسی وقت وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے زبان کا کردار ختم ہو جاتا ہے، جب کہ اَدبی اظہار میں ترسیلِ خیال کا عمل اپنے آپ میں

> زبان کی کارکردگی کا محض آغاز بن جاتا ہے …… جو تخلیقی زبان جتنی تہہ دار [کذا۔ تہ دار]، طاقت ور اور ہمہ جہت ہوتی ہے، اُس کی تاثر آفرینی اور کارکردگی کا وقفہ بھی اُسی تناسب سے طویل ہوتا چلا جاتا ہے۔[۷]

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے میقاتیت، یعنی مخصوص وقفے کے ساتھ اشاعت کو صحافت کی مجبوری اور اَدب سے دوری کا ایک سبب بتایا ہے۔[۸] یہ بات غیر اَدبی اخبارات و رسائل کی خبروں، اُن کے ادارتی شذرات، کالموں، مضامین، مراسلوں، خطوط، وغیرہ پر تو صادق آتی ہے لیکن اَدبی صحافت اور صحافتی اَدب کو اس سے مُستثنیٰ قرار دینا پڑے گا۔ ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، مدیر کے کردار کو اہم گردانتے ہیں اور اُس کے مزاج و مذاق کو اَدبی جریدے کی رجحان سازی کے لیے بنیادی قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھی اُن کی مراد محض اَدبی صحافت ہے، عام صحافت نہیں۔ اس کے بعد اُن کے مضمون کا مبحث تمام تر اَدبی صحافت سے متعلق ہے جو مضمون کے عنوان سے بھی ظاہر ہے۔ یہ تمام ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں۔

اوپر کی تمام بحث اور بیانات سے یہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے کہ وقتی اور ہنگامی نوعیت کے ساتھ ساتھ اختصار — عام صحافت، یعنی عام اخبارات و رسائل کی مجبوری ہیں۔ اخبار میں شائع ہونے والی خبروں، ادارتی شذرات، کالموں، مضامین، مراسلات، خطوط، اطلاعات، وغیرہ کا مقصد فوری تاثر قائم کرنا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ تجارتی مقصد کے لیے اور طے شدہ و راہ نما اُصولوں اور منصوبے کے تحت لکھا جاتا ہے۔ اخبار یا رسالے میں خبر سے لے کر اشاعت تک کے مراحل طے کرنے میں جو افراد معاون بنتے ہیں، وہ اخبار یا ادارے کے ملازم ہوتے ہیں اور ادارے کے راہ نما اُصولوں کی پاس داری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اُفتادِ طبع کے خلاف ادارے کے مقاصد، راہ نما اُصولوں اور ضروریات کے تابع رہ کر خدمات انجام دیتے ہیں۔ اُن سب کی مشترکہ جدوجہد یا زیادہ بہتر طور پر، پنچایتی کوششوں یا کاوشوں کی بدولت اخبار کا پیٹ بھرتا ہے اور اخبار یا رسالہ شائع ہوتا ہے۔

اس کے مقابلے میں اَدب میں وقت اور زمانے کی قید نہیں ہوتی۔ بڑا اَدب ہنگامی نوعیّتوں اور ضرورتوں اور کسی قسم کے مادی فائدے سے ماورا ہو کر تخلیق ہوتا ہے۔ اَدبی تخلیق ذاتی ہوتی ہے۔ اس

میں صرف تخلیق کار کی ذات شامل ہوتی ہے، کسی غیر کی نہیں۔ اَدب پارے پر ادیب کے انداز، فکر اور شخصیت کا اثر لازمی طور پر پڑتا ہے۔ اَدب میں زبان کے فن کارانہ استعمال کو فوقیت دی جاتی ہے۔ اَدب میں خبر کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، بلکہ خبر کے تناظر میں جو جذبہ، احساس اور خیال، اندازِ بیان، اُسلوب اور زبان ظاہر ہوتی ہے، اُس کی اہمیت ہوتی ہے۔

جہاں تک اَدب او رصحافت کی بحث میں دوسرے سروکار کا تعلق ہے، یعنی اَدب اور صحافت کی عملی حدود کیا ہیں؟ اس سروکار میں اس اَمر کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ ''اَدب'' اور ''صحافت'' کے تعین کے بعد اخبار یا رسالے میں ان دونوں کی نمائندہ تحریروں کو ایک دوسرے سے الگ کیسے کیا جائے؟ دونوں کی حدود کو کیسے سمجھا جائے اور ان کا تعین کیسے کیا جائے؟ اَدب اور صحافت کی بحث کے دوران کس مواد سے ہمیں سروکار رکھنا چاہیے اور کسے خارج از بحث قرار دینا چاہیے؟ یہ اور ان جیسے دیگر سوالات کا جواب بھی رشید حسن خاں نے جامعیت او رخوب صورتی کے ساتھ دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ہمیں ان خبروں سے بحث نہیں کرنا ہے جو اخبار کے لیے اصلاً مسالا مہیا کرتی ہیں۔ وہ بالکل الگ ایک حصہ ہے۔ خبریں کیسی ہی ہوں، وہ خبریں ہوتی ہیں اور خبریں رہتی ہیں۔ جب ان خبروں کی بنیاد پر کچھ اَور لکھا جاتا ہے، وہ ایڈیٹوریل نوٹ ہو، کوئی مضمون ہو، کوئی افسانہ ہو، نظم ہو یا ڈراما؛ تب اَدب اور صحافت کی بحث شروع ہوتی ہے۔[۹]

اسی سلسلے میں ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

> زبان کے تخلیقی کردار کے سبب ادب اور ترسیلی کردار کے باعث صحافت کے مقاصد اور طریق کار کچھ اتنے مختلف تصور کیے جاتے ہیں کہ دونوں میں اشتراک کی تلاش اسی حد تک محدود ہے کہ ادب اور صحافت دونوں میں اپنے مدعا اور مافی الضمیر کا اظہار بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ تاہم صحافت کی بنیادی صفت چونکہ میقات کی پابندی ہے، اس لیے میقاتی یا periodical ہونے کی صفت روزناموں، ہفتہ وار اخبارات اور ماہ نامے یا سہ ماہی یا شش ماہی کی صورت میں شائع ہونے والے رسالوں میں یکساں طور پر مشترک ہوتی ہے۔[۱۰]

ان دونوں بیانات سے واضح ہوا کہ جن خبروں، ادارتی شذرات، کالموں، مضامین وغیرہ کی

نوعیت ہنگامی اور وقتی ہوتی ہے، وہ خالص صحافت میں شمار ہوں گے۔ جن تحریروں میں اَدبی محاسن پائے جاتے ہیں، وہ عام صحافتی تحریروں سے علاحدہ صحافتی اَدب کی ترجمان ہوں گی۔

تعریف

اُردو صحافت میں شائع ہونے والے اَدبی مواد کے لیے عام طور پر دو طرح کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ ایک ''اَدبی صحافت'' اور دوسری ''صحافیانہ اَدب''۔ اِن دونوں کے علاوہ اُردو صحافت میں اَدبی مواد کی ایک تیسری قسم اَور ہے جسے میں ''صحافتی اَدب'' قرار دیتا ہوں۔ یہاں تینوں کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعریف بھی متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ا۔ اَدبی صحافت

لغات میں اِس اصطلاح کا اندراج نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ نہ تو ''اَدبی صحافت'' پر اس قدر لکھا گیا کہ جس کے باعث یہ اصطلاح رائج ہوسکتی اور نہ یہ اصطلاح تحریروں میں عام طور پر استعمال ہوئی ہے۔ ویسے تو یہ اَدبی اصطلاح قابلِ فہم ہے۔ رشید حسن خاں اس کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''اَدبی صحافت'' کو اگر ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جائے تو پھر اس کا اطلاق اَدبی یا نیم اَدبی رسالوں پر بہتر طور پر ہوگا، مگر یہ ایک الگ اور ایک مستقل موضوع ہے جو ایک مفصّل مقالے کا طلب گار ہے۔[۱۱]

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کے درج ذیل بیان سے بھی اَدبی صحافت کے خدوخال کا کچھ حصّہ واضح ہوتا ہے:

> اَدبی جریدے اپنی میقاتیت کے سبب صحافت کا حصّہ کہلاتے ہیں اور ان میں تخلیقی نوعیت کی شعری اور نثری تحریروں کی اشاعت کے باعث انھیں اَدبی صحافت کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔[۱۲]

ان دونوں بیانات سے واضح ہے کہ ''اَدبی صحافت'' کا اطلاق اَدبی اخبارات و رسائل پر ہو گا۔ ایسے اخبارات و رسائل جن کا مقصد اور منشا اَدب کی اشاعت ہو۔ جیسے اُردو گلدستے، مخزن (لاہور)، زمانہ (کان پور)، ادیب (الٰہ آباد)، صبحِ اُمید (لکھنؤ)، صلاے عام (دہلی)،

معارف (اعظم گڑھ)، ہندُستانی (الٰہ آباد)، ادیب (پشاور)، زبان (منگرول، گجرات)، وغیرہم۔

رشید حسن خاں نے ''اَدبی صحافت'' میں اَدبی اور نیم اَدبی رسالوں کو شامل کیا ہے۔ ''نیم اَدبی'' سے اُن کی کیا مراد ہے؟ اس کی کوئی وضاحت اُنھوں نے نہیں کی۔ غالبًا اُن کے نزدیک ''نیم اَدبی'' رسالے وہ ہیں جن میں اَدب کے ساتھ دیگر موضوعاتِ حیات سے متعلق تحریریں بھی شائع ہوتی رہی ہیں یا ہوتی ہیں، جیسے بیسویں صدی (نئی دہلی)، شمع (نئی دہلی)، منادی (نئی دہلی)، درویش (نئی دہلی)، اور اِن جیسے دیگر رسائل۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس سلسلے میں یہ سوال سر اُٹھاتا ہے کہ ان رسائل میں جو اَدبی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں، وہ اعلیٰ اَدب میں شمار ہوسکتی ہیں یا نہیں؟ یہ اظہر من الشّمس ہے کہ دو ایک مستثنیات کو چھوڑ کر ان رسائل میں سنجیدہ او راعلیٰ اَدب شائع نہیں ہوتا رہا، بلکہ جسے رشید حسن خاں نے ''صحافیانہ اَدب'' کہا ہے (جس کی تفصیل آگے آتی ہے)، یہ تحریریں اُس کے تحت آتی ہیں۔ ان رسائل (اور ان جیسے دیگر رسائل) کا مقصد چونکہ لوگوں کی عام دلچسپی کی تحریریں شائع کرنا ہوتا تھا یا ہوتا ہے، اس لیے انھیں ''اَدبی صحافت'' میں شامل کرتے ہوئے تامل ہونا چاہیے۔ اپنے مفہوم اور دائرۂ کار کے مطابق ''اَدبی صحافت'' کا اطلاق صرف اُنھی اخبارات، رسائل اور جرائد پر ہوگا جن کا مقصد اَدب کی اشاعت رہا ہو۔

ب۔ صحافیانہ اَدب

یہ اِصطلاح ''اَدبی صحافت'' سے بھی زیادہ اجنبی ہے۔ اس کا بھی اندراج لغات سے غیر حاضر ہے۔ یہ اصطلاح بھی صحیح استعمال نہیں ہوتی۔ ''اَدبی صحافت'' کی اصطلاح تو پھر بھی کسی حد تک مستعمل ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ''صحافیانہ اَدب'' کی اِصطلاح شاید رشید حسن خاں کے سوا کسی نے استعمال نہیں کی۔ اُنھوں نے اپنے مضمون میں یہ اصطلاح کم سے کم چودہ بار لکھی ہے۔ ان میں سے پانچ جگہ ''صحافیانہ اَدب'' او رباقی جگہوں پر ''صحافیانہ تحریریں''، ''صحافیانہ انداز''، وغیرہ جیسی اصطلاحیں ملتی ہیں۔[۱۳] ان سب کا تعلق ''صحافیانہ اَدب'' سے ہے۔ اُنھوں نے ''صحافیانہ اَدب'' کی وضاحت یوں کی ہے:

> عام طور پر صحافیانہ اَدب کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے ایسی تحریروں کے لیے جو لکھی گئی تھیں کسی خاص موضوع پر، انھوں نے کم یا زیادہ شہرت بھی پائی اُن دنوں، مگر دو چار یا دس بارہ برس کے بعد اُن کی آب و تاب جاتی رہی اور اخباروں کے پُرانے ایڈیٹوریل نوٹس کی طرح وہ آج بے رنگ اور بے تہہ [کذا۔ تہ] نظر آتی ہیں۔ اسی طرح جب کوئی ادیب بے تکان لکھتا ہے اور ہر موضوع کے ساتھ اُس کا سلوک اِسی طرح کا ہوتا ہے جیسا اخباروں میں فی الفور خبریں بنانے اور ان پر اُسی وقت تبصرے مرتب کرنے والوں کا ہوتا ہے، تو ہم یہ کہتے ہیں کہ صحافت کا انداز غالب آ گیا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ادب کی تہہ داری [کذا۔ تہ داری]، سنجیدگی اور بلندی اِن صاحب کی تحریروں میں نہیں پائی جاتی۔[۱۴]

رشید حسن خاں کے اس بیان کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں ''صحافیانہ اَدب'' بطور موضوع یا مضمون کی بات کی ہے، جب کہ دوسرے حصّے میں اُنھوں نے اسے ایک رجحان قرار دیا ہے۔ میں اس کی مزید وضاحت یوں کروں گا کہ صحافت کی حد تک ''صحافیانہ اَدب'' کو فطری اور میکانکی عمل جاننا چاہیے اور خالص اَدب کے سلسلے میں اسے رُجحان سمجھنا چاہیے۔ دونوں کا دائرۂ عمل اور طریقِ استعمال ایک دوسرے سے جُدا ہے۔ صحافت میں اس کی موجودگی اور حیثیت ایک فطری عمل کی طرح کام کرتی ہے۔ اس سے مراد ایسی تحریروں سے ہے جو بظاہر اَدبی مزاج کی حامل ہوں لیکن سنجیدہ اور اعلیٰ اَدب میں شمار نہ کی جا سکتی ہوں۔ جیسا کہ رشید حسن خاں نے واضح کیا ہے کہ ایسی تحریریں کچھ عرصے تک تو اپنا اثر رکھتی ہیں، اس کے بعد بھلا دی جاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں سنجیدہ اور بڑا ادب تادیر اور اعلیٰ اَدب ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ صحافت کے میکانکی اور میقاتی دائرے میں رہ کر بڑا اَدب ویسے بھی تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔

رشید حسن خاں کی مذکورہ بالا تعریف میں دوسرا حصہ رجحان کی نشان دہی کرتا ہے، یعنی صحافیوں کی طرح بے لگام و بے پناہ لکھنا اور کم سے کم عرصے، دورانیے میں لکھنا اور لکھتے جانا۔ ایسے لکھاری عموماً بڑا اَدب تخلیق کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں ہوتے۔ صحافت کے میکانکی چکّر اور صحافیانہ رجحان سے بڑے اَدیب کی طبیعت کو مناسبت بھی نہیں ہوتی۔ بڑا ادیب یا اعلیٰ اَدب تخلیق

کرنے کی صلاحیت سے فیض یاب کسی مجبوری کے تحت اگر صحافت کے میکانکی نظام کا حصّہ بنتا بھی ہے تو اخبار یا رسالے کے لیے ''صحافیانہ اَدب'' ہی تخلیق کر سکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے ادیبوں اور تخلیق کاروں نے بڑا اَدب ''صحافیانہ'' میکانکی نظام سے باہر تخلیق کیا۔ اس حوالے سے مثال کے طور پر بیسیوں نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان میں عبدالحلیم شؔرر، ریاضؔ خیر آبادی، مولوی محبوب عالم، محمد علی جوہؔر، مولانا حسرؔت موہانی، نیاز فتح پوری، اختر شیرانی، سیّدامتیازعلی تاؔج، عبدالمجید سالکؔ، چراغ حسن حسرؔت، غلام رسول مہؔر، مولوی عبدالحق، فیضؔ، احمد ندیم قاسمی کے نام بلا تکلّف لیے جا سکتے ہیں۔ اُنھوں نے اور اِن جیسے دیگر مشاہیرِ اَدب نے اپنی مایۂ ناز اَدبی تخلیقات صحافت کے دائرے سے باہر رہ کر تخلیق کیں۔ اس کے ساتھ اُن کا صحافیانہ اَدب بھی ہمارے سامنے موجود ہے او رہم بڑی آسانی کے ساتھ دونوں قسم کے اَدب میں تفریق کر سکتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں رشید حسن خاں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اُردو میں صحافیانہ اَدب کی کمی نہیں۔ اس سرمائے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب لوگ یا تو وہ تھے جو اَدب کو صحافت کے انداز سے تجارت کا مال خیال کرتے تھے، یا وہ لوگ تھے جن کے یہاں یہ دونوں لہریں اُٹھتی اور دبتی رہتی تھیں۔ یوں کبھی ادبیت چمک جاتی تھی اور کبھی صحافیانہ انداز غالب آجاتا تھا۔[۱۵]

''صحافیانہ اَدب'' کے سرمائے کی تعداد کے سلسلے میں رشید حسن خاں کا اندازہ یوں درست ہے کہ تحقیق کے مطابق اُردو صحافت کی دو سو (۲۰۰) سالہ تاریخ میں کم و بیش دو ہزار اخبارات اور ایک ہزار رسائل و جرائد شائع ہوئے یا ہو رہے ہیں۔ ان میں ایسے اخبارات و رسائل بڑی تعداد میں ہیں جو چند یا کچھ شماروں کی زندگی پا کر ختم ہو گئے۔ اس کے ساتھ ایسے اخبارات، رسائل و جرائد کی تعداد بھی خاصی ہے جو ایک عرصے تک دنیائے اَدب میں آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز رہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ہزاروں اخبارات و رسائل میں کتنا اور کیسا کیسا اَدبی مواد موجود ہوگا۔ اتنی کثیر تعداد میں اَدبی مواد کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس میں ''صحافیانہ اَدب'' کی تعداد نسبتاً زیادہ، بلکہ کثیر نکلے گی۔

''صحافیانہ اَدب'' کی وضاحت کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے مثال کے طور پر نیاؔز فتح پوری، کرشن چندر، خواجہ حسن نظامی اور ترقی پسند تحریک کے نام لیے ہیں اور واضح کیا ہے کہ ان کی جو

تحریریں رسائل و جرائد میں چھپی ہیں، اُن میں کچھ تو اَدب کے اعلیٰ معیار پر پوری اُترتی ہیں، بقیہ ’’صحافیانہ اَدب‘‘ میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔[۱۶]

ج۔صحافتی اَدب

یہ اصطلاح لغات سے تو غیر حاضر ہے ہی، اسے غالبًا کسی اَور نے بھی اَب تک اُن معنوں میں استعمال نہیں کیا جن میں اسے مَیں استعمال کرتا ہوں۔ میں یہ اصطلاح ایسی ادبی تحریروں کے لیے مخصوص جانتا ہوں جو اُردو کے غیر اَدبی اخباروں، رسالوں اور جرائد میں شائع ہوئی ہوں اور جنھیں سنجیدہ، بڑے اور اعلیٰ اَدب میں شمار کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر اَوَدھ اخبار میں سرشؔار، جاؔہ، وغیرہ کی تحریریں اور تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسیّد، شبلؔی، حاؔلی، نواب محسن الملک، وغیرہ کی تحریریں۔ اسی طرح زمیندار میں مولانا ظفرعلی خاں، الہلال، البلاغ اور لسان الصّدق میں مولانا ابوالکلام آزاد، سچ اور صدقِ جدید میں مولانا عبدالماجد دریا بادی اور جسارت، تکبیر، وغیرہ میں مُشفِق خواجہ کی تحریریں۔

اوپر ’’صحافیانہ اَدب‘‘ کے ذیل میں جس قسم کی تحریروں کی بات اور نشان دہی کی گئی ہے، اس کے تناظر میں غیر اَدبی صحافت میں ’’صحافیانہ اَدب‘‘ کے چھانٹنے کے بعد سنجیدہ اور اعلیٰ معیار کی جو اَدبی تحریریں باقی بچ رہتی ہیں، وہی ’’صحافتی اَدب‘‘ کے ذیل میں رکھی جائیں گی۔ آئندہ کی بحث اور مثالوں سے اس اِصطلاح کا مفہوم اور نوعیت مزید وضاحت کے ساتھ سامنے آ جائے گی۔

۲۔تشکیل

پس منظر اور تاریخ:

اُردو میں صحافتی اَدب کی تشکیل کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمیں اُردو اَدب کی تاریخ میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ یہ واضح ہو چکا ہے کہ قدیم دور میں، یعنی محمد شاہ کے عہد تک فارسی غالب زبان کے طور پر ہندوستان میں رائج تھی، علوم میں بھی اور اَدب کی سطح پر بھی۔ میؔر و سوؔدا کا دور وہ پہلا سنگِ میل ہے جب شاعری کی حد تک اُردو یا ہندی یا ہندوی کو اہمیت ملنی شروع ہوئی اور اُردو اَدب کا دامن شاعری اور نثر کے معاملے میں وسیع ہونا شروع ہوا۔ اُس دور کی اَدبی تاریخ اور معاشرتی روایات کا

مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر پڑھا لکھا شخص اَدبی ذوق سے متصف ہوتا تھا۔ وہ کچھ لکھے یا نہ لکھے، اَدبی محفلوں اور مشاعروں میں شریک ہوتا اور گھریلو اور مجلسی آداب اور رکھ رکھاؤ میں اُس کا اَدبی ذوق دکھائی دیتا۔ اَوَدھ، خصوصاً لکھنؤ کی وضع داری، علمی فضا اور اَدب کے ہرجا چرچے نے روز مرہ کی زندگی اور معاشرت میں اَدب اور اَدبی ذوق کو پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ بادشاہوں، نوابوں اور امیروں نے ادیبوں، خصوصاً شاعروں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے ۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے معروف اور اہم شاعروں کو کسی نہ کسی بادشاہ، امیر، نواب یا متمول شخص سے توسل تھا۔ دن رات فِکرِ سخن ہوتی، مشاعرے اور اَدبی تقریبات منعقد ہوتیں، عاشورے کی مجالس میں سلام اور مرثیے کہہ کر سنائے جاتے۔ بادشاہ، اُمرا، نواب، خود شاعری کرتے اور کسی نہ کسی اُستاد شاعر کے باقاعدہ شاگرد ہوتے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے ، بلکہ اس کے بہت بعد تک، اُنیسویں صدی کے تقریباً اختتام تک اَدبی ذوق وشوق کا یہی عالم تھا۔

مندرجہ بالا صورت حال کو سامنے رکھا جائے تو ابتدائی دور کے اُردو اخبارات کے مواد اور اَدبی رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے اِختصار کے ساتھ ہندوستان میں اخبار نویسی کی تاریخ کا جاننا ضروری ہے۔

صحافت کی تواریخ بتاتی ہیں کہ ہندوستان میں صحافت کا باقاعدہ آغاز کلکتے سے ۱۷۸۰ء میں *Hicky's Bengal Gazette or the Calcutta General Advertiser* نامی انگریزی اخبار کے اجرا سے ہوا۔ یہ اخبار ''بنگال گزٹ'' اور ''ہکیز گزٹ'' کے نام سے بھی مشہور تھا۔[۱۷] اُنیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے ہندوستان بھر سے ۲۸ اخبارات اور ۹ رسائل منظرِ عام پر آچکے تھے۔[۱۸] یہ انگریزی اخبارات انگریز یا یورپین نکالتے تھے۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک یورپ اور مغرب میں اخبار نویسی بہت ترقی کر چکی تھی۔ یورپ کے بعض اخبارات، اخبار نویسی کا ایک مزاج اور طریقۂ کار متعین کر چکے تھے۔ یورپیوں نے جب ہندوستان میں اخبار نکالے تو یہی مزاج ، تجربہ اور طریقۂ کار اُن کے ساتھ یہاں بھی منتقل ہوا۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اخبار نویسی میں مغرب اور یورپ کی ترقی سے براہِ راست فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہندوستانی اخبار نویسی

بھی اُسی جدید طریقۂ کار اور مزاج سے ہم آہنگ ہوتی جو یورپی ماہرین اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس کے مظاہر ہمیں اُن چند ابتدائی اخبارات میں تو نظر آتے ہیں جو یہاں انگریز حکمرانوں کی سرپرستی یا تعاون سے جاری ہوئے اور شائع ہوتے رہے۔ جن اخبارات نے انگریزی تعلیم کی طرح انگریزوں یا یورپیوں کی ہر چیز سے بیر رکھا، وہ اخبار نویسی کے جدید طریقے اور سلیقے سے خالی نظر آتے ہیں۔

اسی صورتِ حال اور تناظر میں اُردو صحافت کا آغاز ہوا۔ شروع میں جو اخبار کلکتے سے جاری ہوئے، وہ عام طور پر انگریز حاکموں کی سرپرستی یا اعانت کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ اُردو صحافت کی تواریخ کے مطابق اُردو صحافت کا باقاعدہ آغاز کلکتے کے اخبار جامِ جہاں نما سے ہوتا ہے۔[۱۹] بھارت میں اُردو کے سب سے بڑے سرکاری ادارے قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی نے مارچ ۲۰۱۶ء میں ایک سہ روزہ اَدبی اجلاس (سیمینار) کا اہتمام کیا۔ یہ اجلاس ''اُردو صحافت کی دو سو سالہ تاریخ'' کے موضوع پر منعقد کرایا گیا۔ اس اجلاس میں شرکت کے لیے ارسال کیے گئے دعوت نامے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ اُردو کا پہلا اخبار ۱۸۱۵ء میں کلکتہ سے مولوی اکرام علی نے جاری کیا جس کے شمارے نیشنل لائبریری، کلکتہ میں محفوظ ہیں۔[۲۰] اگر اسے نئی تحقیق مان کر تسلیم کرلیا جائے تو اُردو صحافت کا آغاز ۱۸۱۵ء سے تسلیم کیا جانا چاہیے۔

مولوی اکرام علی کے مذکورہ اخبار کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے موجود نہیں۔ اندازہ ہے کہ مذکورہ اخبار کلکتے ہی سے جاری ہوا ہوگا، کیونکہ مولوی اکرام علی ۱۸۱۵ء میں (اخبار کے مبینہ اجرا کے وقت) فورٹ ولیم کالج، کلکتے میں ملازم تھے۔[۲۱] ایسی صورت میں یہ سامنے کی بات ہے کہ انھوں نے انگریزوں کی راہ نمائی میں (اور ممکن ہے سرپرستی میں بھی) اخبار نکالا ہوگا۔

اِس تناظر میں اُردو کا دوسرا اور دستیاب مواد کے مطابق اُردو کا پہلا اخبار جامِ جہاں نما تھا جو ۱۸۲۲ء میں کلکتے ہی سے جاری ہوا۔ اس کے کچھ شمارے مختلف کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس پر ایک تفصیلی کتاب گربچن چندن نے بھی لکھی جو اسی اخبار کے نام ہی سے شائع ہوئی۔[۲۲] اس میں جامِ جہاں نما کے مزاج، طریقۂ کار، خبروں کی نوعیت اور ترتیب، وغیرہ کی تفصیلات ملتی ہیں۔ ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس اخبار کے مزاج اور طریقۂ کار پر انگریزی اخبارات کا کافی اثر تھا۔ اس کے

بعد ہندوستان کے تقریباً ہر شہر سے اُردو اخبارات نکلنے شروع ہوئے ۔ ان کی تفصیل دیکھنی ہو تو محمد عتیق صدیقی، مولانا امداد صابری، نادر علی خاں اور ڈاکٹر طاہر مسعود کی تواریخِ صحافت سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

اِسی تناظر میں یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ مالک اور مدیر کی ذاتی طبع اور مزاج بھی اخبارات پر اثر انداز ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر دہلی اُردو اخبار کو اس لیے زیادہ شہرت ملی کہ ایک تو اس کے مدیر اپنے زمانے کے اہم ادیب اور مذہبی و معاشرتی شخصیت تھے، دوسرے، اِس لیے کہ مولوی محمد باقر کی شخصیت اور مزاج نے دہلی اُردو اخبار کا مزاج اور سمت متعین کی۔ اِسی کی پاداش میں اُنھیں پھانسی کی سزا کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اپنے اِسی مزاج اور مقررہ نوعیت کے باعث دہلی اُردو اخبار کا مواد آج بھی ہماری اَدبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اُردو کے صحافتی اَدب کی تشکیل میں مدیر یا مالکِ اخبار کے اس ذاتی رجحان اور مزاج نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

اوپر پیش کی گئی تفصیلات سے اُردو کے صحافتی اَدب کی تشکیل اور روایت کو سمجھنا آسان ہو گا۔ اسی پس منظر اور روایت نے اُردو صحافت اور پھر اُردو کے صحافتی اَدب کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔

خدوخال اور رُجحان :

اُردو صحافت کے تاریخ نگاروں نے اُردو کی ابتدائی صحافت کی کچھ خصوصیات اور خدوخال واضح کیے ہیں۔ اِن مطالعات کی مدد سے ہم اُردو صحافت کے ابتدائی اور بنیادی رجحانات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اُردو کے صحافتی اَدب کی تشکیل میں بھی اِنھی خصوصیات سے مدد ملتی ہے۔ قاضی عبدالغفار کے مطابق: سرسیّد کے دور سے قبل اخبارات کی زبان اَدبی زبان سے مختلف نہ تھی،[۲۳] چنانچہ پنجابی اخبار کا درج ذیل اقتباس درج کر کے اُنھوں نے اس پر تبصرہ بھی کیا ہے۔[۲۴] تھارن ٹن۔صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات سے متعلق اپنی ۱۸۵۰ء کی رپورٹ میں تحریر کرتے ہیں:

> ......بیش تر اخباروں میں عام خبروں کے سوا اَور کچھ نہیں ہوتا۔ جو اخبارات مغربی افکار کی تبلیغ کرتے ہیں، اُن ...... کی خبریں عموماً اچھی ہوتی ہیں اور بیش تر انگریزی اخباروں سے اخذ کی جاتی ہیں۔ ...... تمام مسائل میں عموماً اور سرکاری مفاد کے مسائل میں خصوصاً رائے زنی کرنے میں اخباروں کے ایڈیٹر بالعموم احتیاط برتتے ہیں۔......[۲۵]

اسی طرح ۱۸۵۰ء کی رپورٹ میں جے ڈبلیو شیرر لکھتے ہیں:

> ...... اخبارات ...... کی خبریں متفرق اور غیر سنجیدہ قسم کی ہوتی ہیں۔ بعض بلند حوصلہ اخبارات مقامی انگریزی اخباروں کے اقتباسات بھی شائع کرتے ہیں، اور باقی اخبارات چھوٹی چھوٹی بازاری گپیں چھاپ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ کچھ اخباروں کے ایڈیٹر ...... مذہبی مسایل [کذا] پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں اور مذہبی کتابوں کے اقتباسات شائع کرتے ہیں۔ بعض روشن خیال اخبارات میں ...... سوانح اور سائنس وغیرہ کے ملے جلے معلوماتی مضامین بھی ہوتے ہیں۔
>
> یہ سب اخبارات اگرچہ خوش اُسلوبی و خوش اطواری کے حامل ہیں مگر حکومت کو نہ تو اپنے قوانین وغیرہ کے متعلق دیسی رائے عامہ کے رجحانات ہی کا اِن سے کوئی اندازہ ہوسکتا ہے، اور نہ دیسی عوام کے جذبات و احساسات کا، یا اُن کی ضروریات ہی کا اُن کی وساطت سے گورنمنٹ کو علم ہوسکتا ہے۔[۲۶]

۱۸۵۲ء کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے پی سی اِسمتھ لکھتے ہیں:

> نورالابصار ...... قابلِ قدر اخبار بننے کی صلاحیتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ سداسُکھ لال، جو اِس اخبار کے ایڈیٹر ہیں، انگریزی سے کلی واقفیت رکھتے ہیں، ...... اخبار کی زبان سادہ ہوتی ہے۔ عبارت آرائی سے معرّا ہونے کی وجہ سے دیسی اصحاب اِس کی زبان کو بہت شُستہ نہیں سمجھتے۔[۲۷]

تہذیب الاخلاق کے بارے میں اخبار انجمنِ پنجاب، لاہور، مورخہ ۱۲ فروری ۱۸۷۵ء کی یہ رائے دیکھیے:

> مضمون و بیان کے بلند معیار کی وجہ سے تہذیب الاخلاق قابلِ ستائش ہے۔ یہ اخبار ہر حیثیت سے خرد افروز ہے۔[۲۸]

ناصر الاخبار، دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے ۱۱ فروری ۱۸۷۶ء کے شمارے میں نامہ نگاروں کے لیے ہدایت نامہ تحریر کیا گیا ہے۔ اس کی تیسری شق یوں ہے:

> (۳) کسی قسم کی نظم بلاخلافِ اَدب و ایمان یا بے قاعدہ یا بے معنی یا غیر فصیح یا اُصولِ شاعری کے خلاف ہو، ہرگز چھاپی نہ جائے گی۔[۲۹]

مندرجہ بالا تفصیلات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو صحافت کے آغاز ہی سے اخبارات کو

خبروں کے سلسلے میں انگریزی اخباروں پر تکیہ کرنا پڑتا تھا۔ انگریز حُکام کی سرپرستی میں شائع ہونے والے اخبارات کے لیے یہ ایک طرح کی مجبوری بھی تھی کہ اُنھیں حُکامِ بالا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اُن کی مرضی اور ضرورت کی خبریں انگریزی اخبارات سے حاصل کرنی پڑتی تھیں۔ آزاد اُردو اخبارات کو اگرچہ ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی لیکن اُنھیں مواد کی کمی کا سامنا تھا۔ اس کا حل اُنھوں نے یہ نکالا کہ اَدبی نوعیت کی خبریں، مراسلے اور اَدبی تخلیقات چھاپنی شرع کیں۔

اُردو اخبارات عام خبروں کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ تخلیقات، خبریں اور مراسلے چھاپ کر قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرتے۔ جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے کہ اُنیسویں صدی کے نصف اول، بلکہ پوری اُنیسویں صدی میں عوامی معاشرے کی تشکیل اور پہچان کا بنیادی ذریعہ اَدب تھا، اس لیے اَدب کے تعلق سے خبریں، مراسلے اور مضامین فطری طور پر پسند کیے جاتے تھے۔ اِسی وجہ سے اُردو صحافت کے بہت شروع کے زمانے ہی سے اُردو میں ''صحافتی اَدب'' پیدا ہو گیا تھا اور اس میں روز اَفزوں ترقی اُسی رفتار سے ہوتی رہی۔

بیسویں صدی میں خبر رسانی کے جدید ترین ذرائع آ جانے سے اخبارات کی ضرورتیں بدلتی گئیں۔ جیسے ہندوستان میں ریل، تار برقی، ڈاک کے نظام میں بہتری، ٹیلی فون، ریڈیو، ہوائی جہاز، وغیرہ جیسے ذرائع کے آنے سے خبروں کی ترسیل میں تیزی آتی گئی، چنانچہ آہستہ آہستہ اُردو صحافت (خصوصاً اخبارات) میں professionalism آتا گیا۔ اب دنیا بھر کی اہم اور دِلچسپ خبروں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ غیر اَدبی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی تبصروں اور تجزیوں کی اشاعت ہونے لگی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد تو اُردو کیا، انگریزی اور علاقائی زبانوں کے دیگر اخبارات میں بھی سیاسی تجزیوں کی اشاعت معمول بن گئی۔ وہ تحریکِ آزادی کا دور تھا۔ ہر دیسی اخبار اس تحریک میں پیش پیش نظر آتا ہے۔ زمیندار (لاہور)، انقلاب (لاہور)، احسان (لاہور)، پرتاپ (لاہور)، ہمدرد (دہلی)، وغیرہم، کتنے ہی اہم اخبارات نے خود کو تحریکِ آزادی کے لیے وقف کر دیا۔ آزادی کے بعد تو اُردو اخبارات میں سیاسی و معاشرتی خبریں، تجزیے اور مضامین شائع کرنے کا رجحان عام ہوتا گیا۔

یوں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کی اُردو صحافت کے آغاز ہی سے اُردو کے صحافتی اَدب کا

بھی آغاز ہو گیا تھا۔ شروع میں اُردو کا صحافتی اَدب کثیر تعداد میں تخلیق ہوا لیکن تقریباً ایک صدی بعد اُردو صحافت میں پیشہ ورانہ رُجحان آجانے، تحریکِ آزادی کی سرگرمیوں اور تیز ترین سائنسی ترقی سے اُردو اَدب کے ساتھ ساتھ اُردو اخبارات و جرائد میں بھی اَدب کی اشاعت کا رجحان کم سے کم تر ہوتا ہوا کم ترین سطح پر آ گیا۔ یہ رُجحان یہاں تک غالب ہوا کہ اب اُردو اخبارات و جرائد میں اَدب ثانوی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

اُردو کی ابتدائی اخبار نویسی یا صحافت میں اَدب کے غالب رُجحان کا ایک اَور اندازہ ابتدائی دور کے اُردو اخبارات و جرائد کے ناموں سے ہوتا ہے۔ یہ نام بجائے خود اَدبی مزاج کے حامل ہیں۔ ان میں سے بعض ناموں کی اَدبی کتب بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے ۱۸۵۷ء تک کے ایسے کچھ اخبارات و جرائد کے نام ملاحظہ کیجیے: جامِ جہاں نما، فوائد النّاظرین، قِران السّعدَین، مُحِبِّ ہند، خیرخواہِ ہند، باغ و بہار، مِراۃالعلوم، آفتابِ ہند، کوہِ نُور، ہُماے بے بہا، چشمۂ فیض، آفتابِ عالم تاب، طِلِسم لکھنؤ، سِحرِ سامری، گُلشنِ نوبہار۔[۳۰]

۱۸۵۷ء کے بعد بیسویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیوں تک شائع ہونے والے ایسے اخبارات و رسائل کی تعداد خاصی ہے۔ یہاں مثال کے طور پر اُس دور کے محض مشہور اور اہم نام درج کیے جاتے ہیں: تاریخِ بغاوتِ ہند، طِلِسمِ حیرت، نسیم، شُعلۂ طُور، صُبحِ صادِق، آفتابِ عالم تاب، کارنا مہ، چشمۂ فیض، ذخیرۂ بال گوبند، مخزنِ مسیحی، رتن پرکاش، تہذیبُ الاخلاق، نُورالانوار، منشورِ محمّدی، خیرخواہِ عالم، نُور افشاں، نیّرِراجستھان، چراغِ دہلی، دبدبۂ سِکندری، آفتابِ پنجاب، نُورالآفاق، مرقّعۂ تہذیب، مخزن الفوائد، نیّرِاعظم، مظہرالعجائب، مِہرِ نیم رُوز، تیرھویں صدی، ہزارداستان، فتنہ، عِطرِفتنہ، مہذّب، آزاد، مُلّا دوپیازہ، جعفر زٹلّی، سِحرِ سامری، چودھویں صدی، اِنتخابِ لاجواب، پنجۂ فولاد، ذوالقرنین، لِسان الصِّدق، الہلال، ہمدرد، ہم دم۔[۳۱]

ان سب ناموں کے ملاحظہ کرنے سے اِس اَمر کو تقویت ملتی ہے کہ ابتدائی دور سے لے کر اُردو صحافت کے سو سالہ دور تک اُردو اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والے مواد کا عمومی رُجحان اَدبی رہا ہے ۔خواہ وہ نام ہو یا زبان و بیان اور مشمولات ۔

ایک اَور پہلو دیکھیے ۔ جب اُردو صحافت کا آغاز ہوا ،تب اُردو زبان اور اَدب ترقی کی منازل تیزی سے طے کر رہا تھا۔ تحریر میں عام طور پر اَدبی اُسلوب اور زبان استعمال کی جاتی تھی ۔دُور کیوں جایئے، اُنیسویں صدی عیسوی کی عدالتی کارروائیاں اور منشیانہ تحریریں ہی پڑھ لی جائیں تو اُن کی زبان اور بیان پر ادبیت کے اثرات آسانی کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔ چونکہ اُس عہد میں اَدب کا دور دورہ تھا، تحریر میں (اور کئی جگہ تقریر میں بھی) اَدبی زبان و اُسلوب برتے جانے کو ترجیح دی جاتی تھی، اس لیے اُس دور کے اُردو اخبارات و رسائل میں خبروں، مراسلوں، تبصروں، مضامین، وغیرہ کی زبان اور اُسلوب بھی اَدب سے مملو ہوتا تھا، اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اَدبی تخلیقات میں زبان اور اُسلوب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس سے بھی بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو صحافت کے سو سالہ دور میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کے مواد پر اَدب کے گہرے اور پائیدار اثرات موجود ہیں۔

ایک اَور بالواسطہ اَمر سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل کی اُردو صحافت میں خاص طور پر اور اُنیسویں صدی کے اواخر تک عموماً اُردو اخبارات و جرائد میں اَدب کی اشاعت عام طور پر ہوتی تھی۔ ہندوستان میں اُردو کتابوں کی اشاعت ۱۸۰۲ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے بـاغ اردو کی اشاعت سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح سے ادارہ جاتی اور سرکاری مطبع تھا اور اس میں صرف فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات طبع ہوتی تھیں۔ ۱۸۵۷ء تک ہندوستانی مطابع کی تعداد بہت کم تھی۔ جو تھوڑے بہت مطبعے موجود تھے، اُن میں عام طور پر عام پسند اور نصابی و اسلامی کتابیں شائع کی جاتی تھیں۔ محدود تعداد کے ان مطبعوں میں اَدبی کتابیں کم سے کم چھپتی اور شائع ہوتی تھیں، چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد کم و بیش ۱۸۷۰ء تک (جب ہندوستان میں مطبعوں کی بُہتات ہونے لگی)، زیادہ تر اَدبی تخلیقات کی اشاعت کا بڑا ذریعہ اُردو اخبارات و جرائد تھے۔

۳۔ روایت

مختصر تاریخ اور روایت :

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اُردو صحافت کے آغاز کے ساتھ ہی اُردو کے صحافتی اَدب کا

بھی آغاز ہوگیا۔ یہ بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے کہ اُردوصحافت کے آغاز کے وقت مقامی معاشرے کا عمومی رُجحان اَدب پرست تھا، چنانچہ شروع کے اُردو اخبارات و جرائد میں زبان اور اُسلُوب کی سطح پر اَدب کے اچھے خاصے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں ، بلکہ مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنیسویں صدی کے آخر تک کے اُردو اخبارات کی زبان عموماً اور ۱۸۷۰ء تک کے اُردو اخبارات و جرائد کی زبان خصوصاً اَدبی مزاج کی حامل ہے۔ یہ رُجحان آسانی کے ساتھ مشاہدہ کرنا ہوتو اُردوصحافت کی تاریخوں اور متفرق مضامین و مقالات میں اِن اَدوار کے اخبارات اور جرائد کے اقتباسات کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

اُردو کے صحافتی اَدب کی تاریخ تفصیل طلب ہے جسے چند صفحوں میں سمیٹنا مشکل ہے۔ اِس مضمون میں ضخامت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُردو کے صحافتی اَدب کی تاریخ کے ضمن میں کچھ تفصیلات نہایت اختصار کے ساتھ ہی پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے ،اس لیے اُمید رکھنی چاہیے کہ آئندہ اِس موضوع پر دیگر قلم کار بھی خامہ فرسائی کریں گے :

صلاے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

اُردو کا پہلا اخبار مولوی اکرام علی کا نکالا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی شمارہ یا نمونہ اور متعلقہ تفصیلات سرِ دست میرے سامنے نہیں، اِس لیے اِس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں۔ مولوی اکرام علی کے علمی و اَدبی کارنامے ترجمۂ اِخوان الصّفا سے اَدبی دُنیا واقف ہے۔ اِس کی زبان اور اُسلوب اتنا دلچسپ ہے اور یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ عرصے تک نو وارد انگریزوں کے اُردو نصاب میں شامل رہی۔ اس کی متعدد اشاعتیں ہندوستان اور اِنگلستان سے منظرِ عام پر آئیں۔ مولوی اکرام علی کی اس مشکور مساعی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی زبان اور اُسلوب کا رنگ اُن کے مبینہ اخبار کی زبان و بیان میں بھی موجود رہا ہوگا۔

اُردو کا پہلا دستیاب اور معروف اخبار جامِ جہاں نُما ہے ۔ اس کا اجرا ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو ہفت روزے کے طور پر کلکتے سے ہوا۔ اس کے پہلے سات شمارے اردو میں نکلے، آٹھویں شمارے، مورخہ ۱۵ مئی ۱۸۲۲ء سے یہ اُردو اور فارسی زبان میں شائع ہونے لگا۔ اس کے صرف دو شماروں کے بعد ہی ۲۹

مئی ۱۸۲۲ء سے یہ مکمل طور پر فارسی میں نکلنے لگا،[۳۲] پھر ۲۳ مئی ۱۸۲۳ء سے ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء تک فارسی کے ساتھ ساتھ اِس کا ایک اُردو ضمیمہ بھی نکلتا رہا جس میں خبروں کے علاوہ اَدبی مواد اور مکمل اَدبی ضمیمے بھی شائع ہوتے تھے۔ یہی اس اخبار کے اُردو حصے کی تاریخ ہے۔[۳۳] جامِ جہاں نُما کے شروع کے سات اُردو اور دو اُردو فارسی شماروں کے بعد اُردو ضمیمے کے کُل ۲۴۱ شمارے شائع ہوئے۔ اِن ۲۴۱ ضمیموں میں کُل مِلا کر ۶۲۰ اُردو خبریں اور ۱۰۰ سلسلہ وار مضامین شائع ہوئے۔[۳۴] اُردو ضمیمے کے آخری شمارے میں اَلْف لیلیٰ کے اُردو ترجمے کی اشاعت کا اظہار کیا گیا جو اُردو ضمیمے کی بندش کے باعث اُس میں تو شائع نہیں ہو سکا لیکن فارسی اخبار کے دور میں ۳۰ جنوری ۱۸۲۸ء سے اس کی سلسلہ وار اشاعت اخبار میں شروع ہوئی۔[۳۵] اس کے علاوہ ایک اینگلو انڈین شاعر ڈی کاسٹا کا اُردو کلام بھی اخبار میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اِس شاعر کا اُردو کلام اخبار میں اُردو ضمیموں کے علاوہ فارسی اخبار کے ۳ فروری اور ۱۲ مارچ ۱۸۲۸ء کے شماروں میں بھی شائع ہوا۔[۳۶] جامِ جہاں نُما کے مدیر سدا سُکھ لال تھے۔ وہ اپنے دور کی معروف اَدبی شخصیت تھے۔ گربچن چندن نے اُن کی سولہ اُردو اور ایک ناگری (ہندی/ سنسکرِت) کتاب کی تفصیل دینے کے علاوہ اُن کی کچھ کتابوں کے سرورق کی عکسی نقول بھی اپنی کتاب میں شامل کی ہیں۔[۳۷] اس سے سدا سُکھ لال کے اُردو قلم کار اور ادیب ہونے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جامِ جہاں نُما کے جو اقتباس گربچن چندن، امداد صابری، محمد عتیق صدیقی، نادر علی خاں اور ڈاکٹر طاہر مسعود (بالواسطہ) نے درج کیے ہیں،[۳۸] اُنھیں پڑھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جامِ جہاں نُما کی زبان سراسر اَدبی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اخبار کے اُردو ضمیمے میں جو کتابیں قسط وار چھپتی تھیں، اُن کا تعلق بھی علم و اَدب سے تھا۔ اخبار کی زبان و اُسلوب اور مدیر کی اَدبی شخصیت کے تناظر میں اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ جامِ جہاں نُما میں کثیر تعداد میں صحافتی اَدب ملے گا۔

۱۸۵۷ء سے قبل کا ایک اہم ترین اخبار ہفتہ وار دہلی اُردو اخبار ہے جس کا آغاز دہلی سے ۱۸۳۶ء میں ہوا۔ شروع میں یہ دہلی اخبار کے نام سے ۱۰ مئی ۱۸۴۰ء تک شائع ہوا، ۱۷ مئی ۱۸۴۰ء سے یہ دہلی اُردو اخبار کے نام سے نکلنے لگا۔ اس کے طابع اور مالک مولوی محمد باقر تھے، جنھیں اَدبی دُنیا مولانا محمد حسین آزاد کے والد کی حیثیت سے جانتی ہے۔ مولانا آزاد بھی کچھ عرصہ اِس

اخبار کے مُنصرم رہے۔ یہ اخبار مولوی محمد باقر کی شہادت، مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء مطابق ۲۶ محرم الحرام ۱۲۷۲ھ تک جاری رہا۔[۳۹] اس کا آخری شمارہ ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو نکلا اور آخری سات شمارے اخبار الظّفر کے نام سے شائع ہوئے۔[۴۰] دہلی اردو اخبار میں عام طور پر سیاسی و سرکاری خبریں اور احکامات شائع ہوتے تھے۔ اس اخبار کے ابتدائی شماروں میں ادبی حوالے سے زیادہ مواد نہیں ملتا اور آخری زمانے، یعنی ۱۸۵۷ء میں تو یہ جنگِ آزادی کی خبروں اور پراپیگنڈے کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ اس میں مستقل گوشے ''حضورِ والا'' اور مقامی خبروں میں ادبی شخصیات سے متعلق تفصیلات کے علاوہ کتابوں کے اشتہاروں سے ہی کچھ ادبی معلومات حاصل ہوتی ہیں، البتہ اخبار کی زبان اور اندازِ بیان میں ادبی رنگ غالب ہے جو اس کی ادبی اہمیت بڑھانے کا باعث ہے۔ اس حوالے سے خواجہ احمد فاروقی نے دہلی اردو اخبار کی ادبی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

> سیاست سے قطعِ نظر دہلی اردو اخبار کی ادبی اہمیت بھی ہے۔ اول تو یہ کہ مولوی محمد باقر اور مولوی محمد حسین آزاد اس کے دامن سے وابستہ تھے جن کی علمی حیثیت مسلم ہے۔ دوسرے غالبؔ، ظفرؔ، ذوقؔ، حافظ غلام رسول ویرانؔ، میرزا نور الدین خلف میرزا سلیمان شکوہ، میرزا جواں بخت، میرزا حیدر شکوہ اور نواب زینت محل کے متعلق اس میں بے مثل مواد ملتا ہے...... دہلی اردو اخبار کا ذکر غالبؔ کے خطوں میں، بہادر شاہ کے مقدمے میں اور گارساں دتاسی کے لیکچروں میں موجود ہے جو اس کی اہمیت کے شاہد ہیں۔ اس سے زبان و ادب کی رفتار معلوم ہوتی ہے اور تاریخ کے بہت سے گوشے ایک ڈائری کی شکل میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔[۴۱]

اسی کے ساتھ خواجہ احمد فاروقی نے اخبار کے ۸ ستمبر ۱۸۵۲ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اس مشاعرے کی روداد کا ذکر کیا ہے جو میرزا سلیمان شکوہ کے صاحب زادے میرزا نورالدین نے اگست ۱۸۵۲ء میں منعقد کیا تھا اور جس میں غالبؔ، ظفرؔ، وغیرہ نے بھی شریک ہو کر اپنا کلام سنایا تھا۔[۴۲] دہلی اردو اخبار کے ۱۸۴۱ء کے مرتبہ و مطبوعہ شماروں میں ادبی حوالے سے جو اہم تر مواد ملتا ہے، اس میں قمار بازی کے سلسلے میں غالبؔ کی رہائش گاہ پر سرکاری اہل کاروں کے چھاپے، اس میں ان کی اور دیگر افراد کی گرفتاری اور جرمانے کی خبر، ذوقؔ و ظفرؔ کا کلام اور کسی تذکرے سے نقل کر کے کسی

نامہ نگار کی جانب سے بھجوائے گئے اشعار کی اشاعت شامل ہے۔[۴۳] اس کے علاوہ مولوی محمد باقر چونکہ شیخ ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد تھے، اِس لیے اُن سے متعلق مواد اور اُن کا کلام اِس میں شائع ہوتا تھا۔ غالبؔ سے متعلق بعض خبریں بھی اس میں ملتی ہیں۔ ان خبروں میں قمار بازی کے سلسلے میں غالبؔ کی گرفتاری کی طویل خبر بھی شامل ہے۔ ذوقؔ کے علاوہ اخبار میں غالبؔ، مومنؔ، ظفرؔ، حافظ ویرانؔ اور دیگر اساتذہ وشعراے دہلی کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ وفاتِ ذوقؔ کی خبر اور تاریخیں بھی پہلی بار اِسی اخبار میں شائع ہوئیں۔[۴۴] مولانا آزادؔ اس اخبار کے آخری دور میں اِس کے مہتمم رہے۔ ۲۴مئی ۱۸۵۷ء مطابق ۲۹ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ کے شمارے میں اُن کا قطعہ ''تاریخ انقلابِ عبرت افزا'' شائع ہوا۔[۴۵] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزادؔ کی تحریریں بھی اِس اخبار میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مولانا آزادؔ جس پاے اور درجے کے ادیب ہیں، اُس کے پیشِ نظر یہ واضح ہے کہ اُن کا لکھا ہوا ایک ایک جملہ اَدبِ عالیہ کا حصّہ ہے۔ اُن کے علاوہ اُس دور میں دہلی کے اُدبا وشُعرا کی اہم اور کثیر تعداد موجود تھی جن سے مولوی محمد باقر اور مولانا آزادؔ کے باعزت مراسم بھی تھے۔ ان میں سے جانے کتنے اہم شعرا و ادبا کا کلام اور تحریریں، اس اخبار میں شائع ہوئی ہوں گی۔ اِن سب تفصیلات کو دیکھتے ہوئے اور دہلی اُردو اخبار اور اِس کے وابستگان کا مقام و مرتبہ دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دہلی اُردو اخبار میں خاصی تعداد میں صحافتی اَدب موجود ہے۔

سید الا خبار، دہلی سے شائع ہونے والا دوسرا اہم ترین اخبار ہے۔ سید الا خبار ۱۸۳۶ء میں شروع ہوا۔ اسے سر سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے شروع کیا اور یہ اُنھی کے مطبع میں سید عبدالغفور کے اہتمام سے ہفتہ وار طبع و شائع ہوتا تھا۔[۴۶] ۱۸۴۶ء میں سیّد محمد خاں کے عالمِ جوانی میں انتقال کر جانے کے بعد سید الا خبار کی نگرانی سید احمد خاں کو کرنی پڑی۔ سرسید احمد خاں کے لیے اپنی منصبی اور تالیفی مصروفیات کے باعث اخبار کے لیے وقت نکالنا دُشوار تھا، چنانچہ ۱۸۴۹ء میں سید الا خبار بند ہوگیا۔ ۱۸۴۶ء میں سرسید اپنی اہم تالیف آثار الصّنادید کے لیے مواد جمع کرنے کی غرض سے دن رات محنت کر رہے تھے۔ اِس لیے بھی اخبار پر پوری توجہ صرف نہ کر سکے۔ اپنی شدید مصروفیات کے باوجود سرسید نے سید الا خبار کو محض معاشی حالات بہتر کرنے کی غرض سے

جاری رکھنا قبول کیا، جیسا کہ خواجہ الطاف حسین حآلی بیان کرتے ہیں، لیکن سرکاری رپورٹوں کے مطابق سیــــد الا خبـــــار کی اشاعت بتدریج کم ہوتی گئی۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۸۴۸ء میں اخبار کی اشاعت محض ۲۷ کاپیوں تک محدود ہوگئی اور اخبار کی آمدنی وخرچ برابر ہوگیا۔ اِن حالات میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس مالی فائدے کے خیال سے سرسید نے سیـد الا خبـار کا جاری رکھنا قبول کیا تھا، وہ پورا نہیں ہو سکا، اوپر سے اُن کی منصبی اور تالیفی مصروفیات۔ اِن کے باعث اتنی فرصت نہ ہوتی ہوگی کہ سرسید اخبار کو مناسب وقت دے پاتے۔ اسی لیے ۱۸۴۹ء میں سیـد الا خبار اور ''مطبع سید الا خبار'' بند ہوگئے۔[۴۷]

سرسید کا تعلق سیـد الاخبار سے گہرا تھا۔ برادرِ بزرگ کے جاری کردہ اخبار میں اور اسے کامیاب کرنے کے لیے سرسید اس میں مضمون نگاری کرتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حآلی لکھتے ہیں کہ اُس زمانے میں سرسید کی عُرفیت ''سید'' تھی۔ سید محمد خاں کو اپنے برادرِ خورد سید احمد خاں سے محبت تھی، اِس لیے اُنھوں نے اس اخبار کا نام سید صاحب کے نام پر رکھا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''سرسید کی ابتدائی تحریریں غالبًا سید الاخبار میں درج ہونی شروع ہوئی تھیں۔'' مزید یہ کہ سرسید نے ''سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اَور شخص کے سپرد کر رکھا تھا مگر زیادہ تر سرسید خود اُس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔''[۴۸]

سیــــد الاخبـــــار کے شمارے کمیاب بدرجہ نایاب ہیں، اس لیے سرِ دست اُن مضامین یا تحریروں کی نشان دہی ممکن نہیں جو سرسید کے قلم سے نکلیں اور سیــد الاخبـار میں شائع ہوتی رہیں۔ یاد رہے کہ سیـد الاخبار کے اجرا (۱۸۳۶ء) اور اخبار کی براہِ راست نگرانی سنبھالنے (۱۸۴۶ء) تک سرسید احمد خاں کی درجِ ذیل تصانیف وتالیفات وتراجم شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکے تھے:

۱) جامِ جم (فارسی تصنیف، مطبوعہ ۱۸۴۰ء)۔

۲) قواعدِ صرف و نحوِزبانِ اُردو (اُردو تصنیف، غیر مطبوعہ، تصنیف ۱۸۴۰ء)۔

۳) جلاء القلوب بذکر المحبوب (اُردو تصنیف، مطبوعہ ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء)۔

۴) تسہیل فی جرّالثقیل (اُردو ترجمہ، مطبوعہ آگرہ، ۱۸۴۴ء)۔

۵) تحفۂ حسن (اُردو ترجمہ از شاہ ولی اللہ، مطبوعہ ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء)۔

۶) فوائد الافکار فی اعمال الفرجار (اُردو ترجمہ از خواجہ فریدالدین احمد، مطبوعہ ۱۸۴۶ء)۔[۴۹]

اس تفصیل سے علم ہوتا ہے کہ سرسید کی تصنیفی وتالیفی زندگی کا آغاز سید الاخبار کے اجرا کے بعد ہوا۔ میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کر رہا ہوں کہ سرسید میں تصنیف وتالیف کی جانب رغبت سید الاخبار سے پیدا ہوئی۔ گھر کا اخبار، وہ بھی بڑے بھائی کا جاری کردہ اور اس کی کامیابی میں کردار ادا کرنے کا خیال اور احساس تو سرسید کو رہا ہی ہوگا جس نے اُنھیں مضمون نگاری کی جانب راغب کیا ہوگا۔ اِس تناظر میں یہ بھی اہم ہو جاتا ہے کہ سرسید جیسے نابغۂ روزگار اُردو نثر نگار اور ادیب کی ابتدائی تربیت گاہ یہی سید الاخبار بنا۔ کم وبیش تیرہ (۱۳) سال کی زندگی میں اس اخبار نے دہلی کے سید زادے احمد خاں کو ہندوستان اور اُردو زبان و اَدب کے لیے مایۂ ناز سرسید احمد خاں بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ سید الاخبار کی یہ بالواسطہ خدمت اُردو زبان و اَدب کی تاریخ میں لازوال ہے۔

۱۸۴۶ء تک سرسید کی مذکورہ بالا تصانیف وتالیفات کی فہرست دیکھنے سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ ممکن ہے کہ ان میں سے ایک یا ایک سے زائد یا تمام کی تمام کتابیں پہلے قسط وار سید الاخبار ہی میں شائع ہوئی ہوں۔ اِن سب کتابوں کی ضخامت بہت زیادہ نہیں۔ ضیاء الدین لاہوری نے مذکورہ بالا فہرست میں ہر کتاب کے ساتھ اُس کی ضخامت بھی تحریر کردی ہے۔ اس کی تفصیل کے مطابق مذکورہ کتابوں کی ضخامت بالترتیب یوں ہے:

۱) ۲۶ صفحات۔

۲) مخطوطہ، مشتمل بر ۳۲ اوراق / ۶۱ صفحات۔ (ممکن ہے کہ یہ کتاب قسط وار سید الاخبار میں طبع ہوگئی ہو لیکن کتابی صورت میں شائع نہ ہوئی ہو)۔

۳) ۶۴ صفحات۔

۴) ۳۸ صفحات۔

۵) تفصیل دستیاب نہیں، لیکن چونکہ یہ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ کے ایک باب (باب دہم) کا ترجمہ ہے، اس لیے اس کی ضخامت بھی ۴۰ صفحات سے زیادہ

ہونے کا امکان نہیں۔

۶) ۹۹ صفحات۔

ان سب کا مجموعہ : ۲۶ + ۶۱ + ۶۴ + ۳۸ + ۴۰ (قیاساً) + ۹۹ = ۳۲۸ صفحات بنتا ہے۔

سیـد الاخبـار ہفتہ وار تھا۔ اس حساب سے سال میں اس کے ۵۲ شمارے نکلتے تھے۔ ۱۸۳۶ء سے ۱۸۴۹ء تک کم و بیش چودہ (۱۴) سال تک اس کی اشاعت ہوئی لیکن ۱۸۴۶ء تک اسے شائع ہوتے کم و بیش دس سال ہو چکے تھے۔ اس حساب سے ان دس سالوں میں اس کے ۵۲ × ۱۰ = ۵۲۰ شمارے شائع ہونے چاہئیں۔ یہ تعداد ۵۰۰ بھی ہو اور سرسید کا تحریر کردہ ایک صفحہ بھی سیـد الاخبـار کے ہر شمارے میں شامل ہوتا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ۵۰۰ شماروں میں ایک صفحہ فی شمارے کے حساب سے ۱۸۴۶ء تک سرسید کی تحریروں کے کم و بیش ۵۰۰ صفحات سیـد الاخبـار میں شائع ہونے چاہئیں۔ ممکن ہے کہ مذکورہ بالا کتابوں (اگر سید الاخبار میں قسط وار شائع ہوئی ہیں) کے علاوہ بھی سرسید کی متفرق تحریریں سید الاخبار میں موجود ہوں۔

اس تفصیل سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ سرسید احمد خاں کو اُردو کی اَدبی تاریخ میں جو نمایاں مقام حاصل ہے، اس کی تربیت کا نقطۂ آغاز سید الاخبار ہی ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ سید الاخبار کی تربیت گاہ سرسید کو اگر میسر نہ ہوتی تو اُن کی تحریر کے نکھرنے اور ذوق کے سنورنے میں مزید وقت لگتا۔

سرسید کے علاوہ اُس دور کے دیگر دہلوی ادیبوں کی تحریریں بھی سیّـد الاخبـار میں شائع ہوتی ہوں گی۔ سرسیّد کا خانوادہ دہلی کے معزز اور مقتدر خانوادوں میں شامل تھا۔ عمائد و اُدبائے دہلی سے اس خانوادے کے اچھے روابط تھے۔ مرزا غالبؔ کو بھی اس خانوادے سے گہرا ربط تھا۔ اسی ربط کے پیشِ نظر اُنھوں نے اپنے اُردو دیوان کی اشاعت اول کے حقوق سیّد محمد خاں کو دیے جن کی نگرانی میں دیـوانِ غـالبؔ اُردو پہلی بار ۱۸۴۱ء میں سیّد الاخبار کے مطبع ہی سے طبع و شائع ہوا۔ اس کے علاوہ غالبؔ نے میجر جان کوب کے نام اپنے ایک فارسی خط میں سیّد الاخبار کا ذکر خصوصی طور پر کیا ہے۔[۵۰] اُس وقت دہلی میں دہـلـی اُردو اخبار بھی موجود تھا، بلکہ دہلی میں اُسی کا ڈنکا بج رہا تھا لیکن غالبؔ نے اُس کا ذکر نہیں کیا۔ اِس تناظر میں یہ بھی قرین قیاس ہے کہ غالبؔ کی تحریریں سیّد الاخبار میں

شائع ہوئی ہوں۔ غالبؔ کے علاوہ شیفتہؔ، آزردہ، مولوی کریم الدین وغیرہ کی تحریریں بھی سیّد الاخبار میں شائع ہونے کا قوی اِمکان ہے۔ شاہِ دہلی کی جانب سے سرسید کے والد اور اُن کی وفات کے بعد سرسید کو خطاب و القاب عطا ہوئے تھے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا سہل ہے کہ خانوادۂ سیّد کے دہلی کے قلعۂ معلّا سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ اِس لیے شاہ زادگان اور قلعۂ معلّا کے متعلقین کا کلام اور تحریریں سیّد الاخبار کی زینت بنتی رہی ہوں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

۱۸۵۷ء سے قبل شائع ہونے والا ایک اہم ترین اخبار کوہِ نور ہے۔ یہ تاریخ ساز اخبار لاہور سے ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ء کو ہفتہ وار جاری ہوا جو بعد میں ہفتے میں دو بار شائع ہونے لگا، پھر ہفتے میں تین بار اور ۱۸۸۳ء میں روزانہ نکلنے لگا، بعد ازاں دوبارہ ہفتہ وار ہو گیا۔[۵۱] یہ اخبار منشی ہرسکھ رائے نکالتے تھے۔ مولوی سیف الحق ادیبؔ، سیّد نادر علی سیفی، میر نثار علی شہرتؔ، منشی نول کشور، محمد الدین فوقؔ اور محرم علی چشتی وقتاً فوقتاً اِس اخبار کے مدیر رہے۔[۵۲]

یہ اخبار بعض حوالوں سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اول یہ کہ یہ پنجاب سے شائع ہونے والا پہلا اُردو اخبار ہے۔ دوسرے یہ کہ ۱۸۵۷ء سے قبل پنجاب سے شائع ہونے والے اخبارات میں یہ سب سے زیادہ اہم اخبار ہے۔ تیسرے، انیسویں صدی عیسوی میں طویل عرصے تک شائع ہونے والے اخبارات میں کوہِ نور بھی شمار ہوتا ہے۔ یہ اخبار ۱۸۵۰ء میں جاری ہوا اور نصف صدی سے زائد کے عرصے تک جاری رہا۔ چوتھے، معروف ناشر اور اخبار نویس منشی نول کشور نے صحافتی و طباعتی زندگی کا ابتدائی حصّہ اِسی اخبار میں گذارا۔ منشی نول کشور نے صحافت اور طباعت کے میدان میں جو تجربہ کوہِ نور سے حاصل کیا، وہ آئندہ زندگی میں مطبع اَودھ اخبار، مطبع منشی نول کشور اور اَودھ اخبار کی کامیاب اشاعت میں اُن کے کام آیا۔ امداد صابری نے ایک جگہ اُنھیں کوہِ نور کے مدیران میں شامل کیا ہے اور دوسری جگہ اُن کے ایک اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۱ء میں منشی نول کشور مطبع کوہِ نور کے منیجر تھے۔[۵۳] پانچویں، یہ اخبار اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں پنجاب کی سیاسی، معاشرتی، علمی اور اَدبی تاریخ کے بنیادی مآخذ میں شمار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر طاہر مسعود نے کوہِ نور کے خاصے شماروں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے

مشتملات کی تفصیل اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ اُن کے مطابق کوہِ نور میں خبروں کے علاوہ مراسلے اور شاعری شامل ہوتی تھی، اداریے یا مضمون نہیں ہوتے تھے۔ شاعری کے تحت اُردو، فارسی غزلیں، قِطعاتِ تاریخ، وغیرہ چھپتے تھے۔ اُن کے مطابق اخبار میں شائع ہونے والی سب سے پہلی شعری تخلیق ۱۸ مارچ ۱۸۵۰ء کے شمارے میں منشی ہر سُکھ رائے کے مطبعے کا قطعۂ تاریخ ہے، جو لاہور کے قدیم اور معروف شاعر پنڈت اَمر ناتھ اکبؔر کا زائیدۂ فکر ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے مہاراجا دلیپ سنگھ کی معزولی کے قطعۂ تاریخ اور مسلسل کئی ہفتوں تک قطعاتِ تاریخِ وفاتِ ذوقؔ شائع ہونے کی خبر بھی دی ہے۔ اِسی سلسلے میں بہادر شاہ ظفؔر کے قطعے کے دو شعر بھی نقل کیے ہیں۔[۵۴] امداد صابری نے اِسی سلسلے میں مولانا امام بخش صہبائؔی کا قطعۂ تاریخ درج کیا ہے۔ امداد صابری نے کوہِ نور میں حضرت امام حسین کی مدح [منقبت ؟] اور نعتِ رسولؐ کی اشاعت کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ اِن کے علاوہ:

> کوہِ نور میں خبروں کے ساتھ ساتھ تاریخی، معلوماتی اور اَدبی مضامین بھی شامل ہوتے تھے، کتابوں پر آزادانہ تنقیدیں کی جاتی تھیں۔ یہ تنقیدیں صرف اُردو زبان کی کتابوں پر ہی نہیں، بلکہ فارسی، عربی، سنسکِرت کی کتابوں پر بھی ہوتی تھیں ...... نوجوان شعرا کے کلام بھی درج ہوتے تھے۔[۵۵]

منشی ہر سُکھ رائے اُردو کے اَدبی ذوق سے بہرہ مند تھے۔ اسی لیے ۱۸۵۴ء میں اُنھوں نے کوہِ نور کے دفتر میں ایک مشاعرے کا آغاز کیا۔ وہ اِس مشاعرے کی غزلیں اخبار میں شائع کرتے تھے۔ اس سلسلے میں کوہِ نور کی ۲۱ مارچ ۱۸۵۴ء کی اشاعت میں جو اشتہار شائع ہوا، وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

> بخدمت شائقانِ مشاعرۂ مطبع کوہِ نور لاہور یہ ہے کہ پہلے سے جو جلسہ مشاعرہ کا ہر یک شنبہ کو سات بجے شام ہوتا تھا، اب حسبِ صلاح اجتماعِ جلسۂ مذکور پانچ بجے شام سے قرار پایا، لہٰذا گذارش [کذا] ہے کہ آئندہ سب اصحاب پانچ بجے شام سے رونق پذیرِ جلسہ ہوا کریں، اور تجویز ہے کہ آئندہ سے کچھ غزلیں منتخبہ ہر پرچۂ اخبار میں چھاپی جاویں گی اور بعد اِس کے مشاعرۂ آئندہ کے لیے مصرعِ طرح لکھے جاویں

گے، چنانچہ اِس ہفتہ کے مشاعرہ کی مصرعِ طرح یہ ہیں:

طرحِ فارسی:

کلہ کج کردہ و خنجر بکف مستانہ می آید

طرحِ اُردو:

غالبؔ کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے[56]

اس کے بعد امداد صابری نے اِن مشاعروں کی شائع ہونے والی غزلوں میں سے دو منتخب غزلیں درج کی ہیں۔[57] اس کے علاوہ ۲۳ فروری ۱۸۵۸ء کے شمارے سے محرم علی چشتی کی اُردو غزل اور ۷ نومبر ۱۸۵۴ء کی اشاعت سے کوہِ نور کی تعریف میں میرانور حسین ہماؔ کا قطعہ بھی امداد صابری نے نقل کیا ہے۔[58] نادر علی خاں نے کوہِ نور کے ۵ جون ۱۸۵۱ء کے شمارے میں مرزا ہرگوپال تفتہؔ کی فارسی غزل کے چھپنے کی اِطلاع دی ہے اور ۱۴ نومبر ۱۸۵۴ء کے شمارے سے ذوقؔ دہلوی کے طویل اُردو قصیدے کے چند اشعار نقل کیے ہیں۔ اُنھوں نے کوہِ نور اور ہرسُکھ رائے کے اَدبی مزاج سے متعلق تحریر کیا ہے:

> منشی ہرسُکھ رائے ایک باذوق اور جہاں دیدہ صحافی تھے۔ اُنھوں نے اپنے اخبار کو صرف خبروں ہی کا مرقّع نہیں بنایا، بلکہ نظم ونثر کے شہ پاروں سے اسے رنگین اَدبی گلدستہ میں بدل دیا۔ اخبارِ مذکور میں صرف اُردو شعرا کی غزلیں اور قصائد ہی شائع نہ ہوتے تھے، بلکہ منشی ہرگوپال تفتہؔ ایسے نغز گو فارسی شعرا کی غزلیں بھی چھپتی تھیں۔[59]

مذکورہ بالا تفصیلات سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ کوہِ نور میں کثیر تعداد میں منظوم ومنثور صحافتی اَدب موجود ہے۔ جہاں ایک طرف یہ اخبار اپنے دور کے سیاسی ومعاشرتی حالات کا بہترین ترجمان ہے، وہیں اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں سرزمین پنجاب کی علمی واَدبی کارگذاریوں کی تفصیل کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ اِس کے شماروں میں اپنے عہد کے کئی اَدب پارے بکھرے ہوئے ہیں اور کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات نظرِ اِلتفات کی منتظر ہیں۔ کوہِ نور کے بہت کم شمارے دستیاب ہیں۔ ممکن ہے کہ تلاش کرنے پر غیر معروف، نجی اور ادارہ جاتی کتب خانوں میں اس کے زیادہ سے زیادہ شمارے مِل سکیں۔ ان دستیاب شماروں میں صحافتی اَدب سے متعلق تحریریں منظرِ عام

پر لا کر اَدب کی بڑی خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔

۱۸۵۷ء سے قبل کا آخری بڑا اور اہم ترین اخبار طلسمِ لکھنؤ ہے۔ یہ اخبار ۲۵ جولائی ۱۸۵۶ء کو فرنگی محل لکھنؤ سے جاری ہوا۔ اسے معروف لکھنوی ناشر محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی نے جاری کیا۔ یہ اخبار ایک سال کے قریب جاری رہا۔ ۸ مئی ۱۸۵۷ء کو اس کا آخری شمارہ نکلا۔[۶۰]

اس اخبار کا ایک مکمل فائل فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عبد الباری کے کتب خانے میں موجود تھا جو اب شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں آ گیا ہے۔[۶۱] اِس فائل کی اشاعت نو ۲۰۱۲ء میں قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی سے ہوگئی ہے۔ اِس میں مکمل فائل سے محض ایک شمارہ کم ہے۔ اِس اخبار کے چند شمارے نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں بھی موجود ہیں۔[۶۲]

طلسمِ لکھنؤ کی طباعت مطبع محمدی لکھنؤ میں ہوتی تھی جو محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی (وفات ۳ جنوری ۱۹۰۸ء) کی ملکیت تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے دوران مطبع اور طلسمِ لکھنؤ، دونوں بند ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اُنھوں نے لکھنؤ ہی سے کارنامہ کے نام سے نیا اخبار جاری کیا اور اسی نام سے ''مطبع کارنامہ'' قائم کیا۔ محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی کا نام رجب علی بیگ سرورؔ کے حوالے سے غیر معروف نہیں۔ مطبع کارنامہ کے لیے اُنھوں نے مرزا رجب علی بیگ سرورؔ سے اُن کی کتابوں کی اشاعت کے حقوق حاصل کیے، چنانچہ فسانۂ عجائب، شبستانِ سُرورؔ، گُلزارِ سُرورؔ، سُرورِ سُلطانی، شگوفۂ محبت وغیرہ جیسی معیاری اور خوب صورت اشاعتیں اسی مطبع سے نکلیں۔

محمد یعقوب فرنگی محلی کو نواب واجد علی شاہ اور سلطنتِ اَوَدھ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی، چنانچہ اُنھوں نے طِلسمِ لکھنؤ کا اِجرا اِنتزاعِ سلطنتِ اَوَدھ کے بعد کیا اور اس میں سلطنتِ اَوَدھ کی نشاۃِ ثانیہ کی نوید سناتے رہے۔ محمد یعقوب فرنگی محلی اور اُن جیسے صاحبانِ ذوق کے لیے سلطنتِ اَوَدھ محض ایک حکومت یا ریاست نہیں تھی، بلکہ تہذیب وتمدّن، ثقافت اور زبان و اَدب کی زندہ اقدار کا گہوارہ تھی۔ اِسی لیے اس کے چلے جانے، یا زیادہ بہتر لفظوں میں غصب کیے جانے پر یہ طبقہ (بلکہ پورا اَوَدھ) خود کو لُٹے پِٹے قافلے کا فرد سمجھنے لگا۔ اُنھیں دل اور روح کی دُنیا ویران ہوتی دکھائی دیتی۔

طِلسمِ لکھنؤ اِنھی جذبات و احساسات اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھا۔ اِس وجہ سے اس میں مقامی خبروں کو نمایاں طور پر اور زیادہ تر شائع کیا جاتا تھا۔ باہر کی خبریں اِس میں کم کم ہی ہوتی تھیں۔ نواب واجدعلی شاہ اپنی معزولی کے بعد مٹیا بُرج کلکتہ میں جا بسے اور اُسے لکھنوِ ثانی بنالیا۔ طِلسمِ لکھنؤ میں نواب واجدعلی شاہ اور اُن کے متعلقین، مٹیا بُرج کلکتہ اور اُن سے متعلق خبریں خاص طور پر شائع ہوتیں۔ سلطنتِ اَوَدھ کی بحالی کے لیے نواب واجدعلی شاہ نے ایک وفد برطانیہ روانہ کیا جسے یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ ملکۂ انگلستان اور مقنّنہ کے اراکین سے مِل کر اپنی بپتا سنائے اور اُنھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کرتا دھرتاؤں کی زیادتیوں سے آگاہ کرے۔ اِس کے علاوہ ملکہ سے درخواست کرے کہ وہ سلطنتِ اَوَدھ کو بحال کرنے کا حُکم نامہ جاری کریں۔ اس وفد کے بارے میں خبریں طِلسمِ لکھنؤ میں اہتمام کے ساتھ چھاپی جاتی تھیں اور باشندگانِ اَوَدھ کو سلطنتِ اَوَدھ کی جلد بحالی کی نوید سُنائی جاتی تھی۔

طِلسمِ لکھنؤ کی زبان اَدبی محاسن سے مملُو ہے۔ اخبار پڑھتے جایئے تو تفصیلات سے یوں محسوس ہوگا جیسے گذشتہ لکھنؤ کا پہلا حصّہ پڑھ رہے ہیں اور زبان سے یوں لگے گا جیسے فسانۂ آزاد یا طِلسمِ ہوش رُبا کے ٹکڑے پڑھ رہے ہوں۔ لکھنؤ کی زبان کا رچاؤ، تکلّف اور خوب صورتی طِلسمِ لکھنؤ کے ہر صفحے، ہر خبر اور ہر مراسلے میں صاف صاف نظر آتی ہے۔ ۱۸۵۷ء تک جو اُردو اخبار شائع ہوئے، زبان و بیان کا ایسا خوش نُما اَدبی رنگ کسی میں اِس قدر نہیں دیکھا جا سکتا جیسا کہ طِلسمِ لکھنؤ میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جامِ جہاں نُما، دہلی اُردو اخبار اور سیّد الاخبار اُس دور کے معروف ترین اور اہم ترین اخباروں میں شامل ہیں۔ زبان میں اِن کی سادگی و سلاست اور بیان میں اِن کے ہاں وضاحت کی تعریف عام طور پر کی گئی ہے لیکن اِن کا اَدبی رُتبہ طِلسمِ لکھنؤ کے مقابلے میں کم ہے۔ ایک تو یہ تینوں دہلی کے اخبار تھے اور دوسرے ان کی اَدبی زبان میں دل نشینی اور گھلاوٹ طِلسمِ لکھنؤ کی نسبت کم ہے۔

طِلسمِ لکھنؤ ایک مکمل اَدبی کارنامہ ہے۔ اس کی اشاعتِ ثانی (قومی کونسل، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء) پڑھتے جایئے تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی قدیم اخبار کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ لگتا ہے جیسے

دبستانِ لکھنؤ کا کوئی نثری شاہ کار پڑھ رہے ہیں۔ اس خصوصیت کی بنا پر طِلِسمِ لکھنؤ کا مکمل فائل ہی صحافتی اَدب کا شاہ کار ہے۔

ان نسبتاً معروف اور اہم ترین اخبارات کے علاوہ آغاز سے ۱۸۵۷ء تک کافی تعداد میں ایسے اُردو اخبارات بھی شائع ہوئے جو کم معروف ہیں۔ اِس جائزے کے دوسرے حصّے میں ۱۸۵۷ء سے قبل کے ایسے ہی کچھ اہم یا اہم تر اخبارات اور ان میں ممکنہ طور پر موجود صحافتی اَدب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

ہفتہ وار فارسی اخبار مراۃ الاخبار، کلکتے سے ۱۸۴۷ء میں شروع ہوا۔ اس میں کبھی کبھی اُردو منظومات، خبریں اور مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ ۱۴ مئی ۱۸۵۱ء کے شمارے میں مرزا فتح اللہ نصیبؔ کے اُردو خط، ۴ جون ۱۸۵۱ء کے پرچے میں فدا حسین (علی؟) عیشؔ کی غزل اور اسی سال کے کسی پرچے میں لالہ اجودھیا پرشاد صبرؔ کی دو غزلوں کی اشاعت کے شواہد ملتے ہیں۔[۶۳]

دہلی سے ۱۸۴۱ء میں ہفتہ وار سراج الاخبار کا اجرا ہوا۔ یہ قلعۂ معلّا سے نکلتا تھا اور شاہِ دہلی بہادر شاہ ظفرؔ کے حکم سے تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہر شمارے کی ایک کاپی انگریز نمائندے متعینہ دہلی کو بھی بھیجی جاتی تھی۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، اِس اخبار کا نام شاہِ دہلی سراج الدین بہادر شاہ ظفرؔ کے نام سے موسوم تھا۔ اس کی زبان فارسی تھی۔ امداد صابری کی تحقیق یہ ہے کہ ''۱۸۵۷ء سے کچھ سال قبل اس اخبار کے آخری دو تین صفحوں پر اُردو کی خبریں دہلی اُردو اخبار، صادق الاخبار کے عنوان کے تحت چھپتی تھیں اور اُردو کی غزلیں بھی درج ہوتی تھیں''۔[۶۴] اُنھوں نے فارسی اخبار کے ذکر میں مرزا غالبؔ کے ایک اُردو خط کا اِقتباس بھی درج کیا ہے جس میں غالبؔ اپنا کلام سراج الاخبار میں چھپنے کا ذکر کرتے ہیں۔ اِس کے علاوہ امداد صابری یہ بھی لکھتے ہیں کہ سراج الاخبار میں غالبؔ، ذوقؔ، ظفرؔ کا کلام شائع ہوتا تھا۔[۶۵] امداد صابری اور محمد عتیق صدیقی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ سراج الاخبار میں شاہِ دہلی کے روز مرہ کے معمولات کی تفصیل درج ہوتی تھی اور آخر میں کچھ خاص خاص خبریں ہوتی تھیں۔[۶۶] لیکن مرزا غالبؔ کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار میں متعلقینِ قلعۂ معلّا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ ذوقؔ اور غالبؔ؛ شاہِ دہلی کے اُستاد تھے۔ اِمکان ہے کہ شاہ کے حُکم پر یا فرمائش، سفارش، خوشنودی کے لیے وہ اپنا کلام سراج الاخبار میں شائع کراتے ہوں گے۔ اُن کے

علاوہ خود ظفؔر اور قلعے کے دیگر شاہی افراد کا کلام بھی اس میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا ہوگا۔ محمد عتیق صدیقی نے سراج الاخبار کے نو (۹) شماروں کی انجمنِ ترقیِ اُردو ہند (تب علی گڑھ، اب نئی دہلی) کے کتب خانے میں اور ۴۶ شماروں کی بھارتی قومی مرکزِ محفوظات (نیشنل آرکائیوز اوف انڈیا)، نئی دہلی میں موجودگی کی اِطلاع دی ہے۔[۶۷] اِن شماروں سے رجوع کر کے اور اِن کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کن کن کی اور کس قدر اَدبی تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ امداد صابری نے اِس اخبار کے ۲۱ مئی ۱۸۵۶ء کے شمارے سے ذوقؔ کے صاحب زادے خلیفہ محمد ابراہیم فوقؔ کی غزل اور ۶ دسمبر ۱۸۵۶ء کے شمارے سے شاہِ دہلی ظفؔر کی تضمین نقل کی ہے۔[۶۸] ۱۸۴۱ء تا ۱۸۴۴ء کے کچھ شماروں اور ان میں شائع شدہ کچھ اَدبی تحریروں کی تفصیل نادر علی خاں نے بھی درج کی ہے۔[۶۹] اِن شواہد سے قوی اِمکان پیدا ہوتا ہے کہ سراج الاخبار میں کافی تعداد میں صحافتی اَدب میسر آ سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے قبل دہلی ہی سے صادق الاخبار نام کے ایک سے زیادہ اخبار جاری ہوئے۔ اِن میں سے پہلا اخبار ۱۸۴۴ء یا جنوری ۱۸۴۵ء میں مطبع دارالسّلام، محلّہ حوض قاضی سے عنایت حسین نے جاری کیا۔ اس اخبار میں بھی دہلی کے دربارِ شاہی کی خبریں چھاپنے کو فوقیت دی جاتی تھی۔ اِس میں قلعۂ مُعلّا کی خبریں پہلے درج ہوتی تھیں، اُس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کی خبریں ہوتی تھیں۔ پہلے اس کی زبان فارسی تھی جو آہستہ آہستہ اُردو ہو گئی۔ یہ اخبار کم سے کم ۱۸۵۳ء تک ضرور نکلا۔[۷۰] تاریخ نگاروں نے اِس اخبار کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں دی، یعنی اس میں خبریں چربہ ہوتی تھیں اور اس کی اشاعت بھی کم تھی، لیکن کم و بیش نو (۹) سال تک جاری رہنے، مواد کی کمی اور سرکاری (دربارِ دہلی اور ایسٹ انڈیا کمپنی) خبریں چھاپنے کی وجہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اِس میں معاصر شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا ہوگا۔ یہ نہ بھی ہو تو شاہی دربار سے تعلق کی وجہ سے اِس کی زبان کا قلعۂ معلاّ کی زبان سے متاثر ہونے کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اِس صورت میں اِس اخبار کی نثر قلعۂ معلاّ کی زبان کا نمونہ تو ہے ہی۔ امداد صابری نے ۷ تا ۲۴ جنوری ۱۸۴۵ء کے شمارے سے کچھ خبروں کے اقتباس درج کیے ہیں۔ اُس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ ''قلعۂ معلّٰی کی زبان میں بھی یہ واقعہ گوش گذار [کذا] کر لیجئے [کذا]''۔[۷۱] اِس کے بعد جو واقعہ اُنھوں نے درج کیا ہے، اُس کی زبان

اُنیسویں صدی کے کسی دہلوی قصّے کی زبان اور اُسلوب سے مشابہ ہے۔ یہ خصوصیت اگرچہ اُس دور کے اخبارات و جرائد میں کسی حد تک مشترک ہے لیکن امداد صابری نے صادق الاخبار کا جو اِقتباس درج کیا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کسی اَور اخبار کی زبان اور بیان قلعۂ مُعلاّ کی زبان اور اُسلوب سے اِس قدر متاثر نہ ہوگا جیسا اِس اخبار کا اسلوب اور بیان ہے۔ صادق الاخبار کی نسبت یہ کہنا کافی ہوگا کہ اِس کے شمارے میسر آئیں تو اس میں شائع ہونے والے صحافتی اَدب کی مقدار اور معیار کا صحیح اندازہ ہوگا۔ سرِدست یہ اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس اخبار میں اَدبی تخلیقات کی اشاعت بھی ہوتی ہوگی۔

دوسرا صادق الاخبار، ۱۸۵۱ء میں مشہور مطبعے مطبع مصطفائی دہلی سے محمد مصطفیٰ خاں مالکِ مطبع کے اہتمام سے شروع ہوا[۴۲] اور ۱۸۵۴ء تک اِس کی اشاعت کے شواہد ملتے ہیں۔[۴۳] اِس اخبار کے شمارے بھی دستیاب نہیں۔ دِتاسی نے اِس اخبار کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے فرانس میں ذخیرۂ دِتاسی میں اس کے شمارے موجود ہوں۔ اسے معروف ناشر محمد مصطفیٰ خاں نے جاری کیا۔ اُن کا مطبع ہندوستان کے ابتدائی دیسی مطابع میں اپنے حُسنِ طباعت اور طبع شدہ کتابوں کی نوعیت کے اِعتبار سے مُمتاز حیثیت کا حامل ہے۔ مطبع مُصطفائی پہلے لکھنؤ میں تھا، بعد میں کان پور اور پھر دہلی میں منتقل ہوگیا۔ محمد مصطفیٰ خاں اپنے دور کے عمائد اور ذی حیثیت افراد میں شمار ہوتے تھے اور معروف ناشر بھی تھے، اس لیے قوی امکان ہے کہ اُن کے معاصر شعرا و اُدبا اُن کے اخبار میں اشاعت کی غرض سے اپنی اَدبی تخلیقات بھجواتے ہوں گے۔ اس پس منظر میں محمد مصطفیٰ خاں کے صادق الاخبار میں بھی اُردو کے صحافتی ادب کا سرمایہ ملنے کا پورا اِمکان ہے۔

تیسرا صادق الاخبار اصل میں محمد مصطفیٰ خاں کے صادق الاخبار ہی کا تسلسل محسوس ہوتا ہے۔ خلاصہ اِس اَمر کا یہ ہے کہ مطبع مصطفائی دہلی میں جمیل الدین خاں ہجؔر نام کے کاتب تھے۔ مطبع مصطفائی کی کتابوں اور صادق الاخبار کی کتابت کرتے تھے۔ محمد مصطفیٰ خاں کا صادق الاخبار ۱۸۵۴ء میں غالبًا بند ہوگیا تو اِنھی جمیل الدین خاں ہجؔر نے اپنے اِہتمام سے اُسی سال اسے دوبارہ ہفت روزے کے طور پر شروع کیا اور اِس کی طباعت کے لیے اپنا مطبع ''جمیل المطابع'' کے نام سے قائم

کیا۔ جمیل الدین ہجر کا یہ صادق الاخبار ۱۸۵۷ء تک جاری رہا، بلکہ اِسے زیادہ شہرت ملی، کہ اس کا ذکر اور حوالہ بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمۂ بغاوت میں بھی آیا۔[۷۴] امداد صابری اور عتیق صدیقی نے اِس اخبار کے ۱۸۵۷ء کے ایک شمارے سے دو فارسی منظومات نقل کی ہیں۔[۷۵] اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس اخبار میں اَدبی نگارشات بھی شائع ہوتی تھیں۔ اِس اخبار کے چند شمارے محفوظ ہیں لیکن وہ سب ۱۸۵۷ء کے ہیں اور ہنگامۂ ۵۷ء سے متعلق ہیں۔[۷۶] اِس سے قبل کے شماروں اور اِس اخبار کے دیگر شماروں میں اَدبی تحریریں مل سکتی ہیں۔

چوتھا صادق الاخبار ۱۸۵۵ء کے اواخر یا جنوری ۱۸۵۶ء میں شیخ خدا بخش کے اِنصرام سے منظرِ عام پر آیا۔ اِس کا صرف ایک ہی شمارہ دستیاب ہے جو ۱۸۵۷ء کا ہے اور ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے متعلق ہے۔[۷۷] اِس کے دیگر شماروں میں بھی صحافتی اَدب کی موجودگی کا امکان ہے۔

۱۸۵۱ء میں سیالکوٹ سے ریاض الاخبار کا اجرا ہوا جو بعدازاں ملتان میں منتقل ہوگیا اور اس کا نام بھی ریاضِ نور ہوگیا۔[۷۸] اِس میں علمی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ عام طور پر یہ انگریزی کے علمی مضامین کے اُردو ترجمے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود کی اِطلاع ہے کہ اخبار میں بعض اوقات کسی کتاب کا تفصیلی اشتہار چھاپ کر اُس کتاب کا کچھ حصّہ بھی درج کر دیا جاتا۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے اخبار کے ۳ مارچ ۱۸۵۵ء کے شمارے میں جیمز کارکرن کی تصنیف کارنامۂ روسی کے تفصیلی تعارف اور پہلے باب کے اندراج کے بارے میں معلومات مہیّا کی ہیں۔[۷۹]

ریاضِ نور کے مدیر منشی محمد مہدی حسین خاں تھے۔ اُن کے اور اخبار کے بارے میں ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۳ء کی سرکاری رپورٹ میں لکھا گیا ہے:

> وہ اول درجے کا اُردو ادیب معلوم ہوتا ہے۔ ...... ایڈیٹر کے فرائض کی انجام دہی کی اُس میں بہت عمدہ صلاحیتیں ہیں ...... اخبار کی زبان شُستہ اُردو ہوتی ہے اور اس کا طرزِ تحریر بہت اچھا ہے۔[۸۰]

اِس بیان سے ریاضِ نُور کے اَدبی مزاج کا مزید اندازہ ہوتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس اخبار میں صحافتی اَدب پر مشتمل تحریروں کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔

۱۸۵۲ء میں سیالکوٹ ہی سے ہفتہ وار اخبار چشمۂ فیض جاری ہوا۔ اِس کے مالک و مدیر منشی رائے دیوان چند تھے۔ ہر سُکھ رائے کے بعد دیوان چند، پنجاب میں اُردو صحافت کا دوسرا بڑا نام ہے۔ اُنھوں نے مختلف اوقات میں سیالکوٹ سے خورشیدِ عالم (۱۸۵۲ء)، چشمۂ فیض (۱۸۵۲ء)، وکٹوریہ پیپر (۱۸۵۲ء)، نُورٌ علیٰ نُور (جریدہ،۱۸۵۶ء)، چشمۂ خورشید (۱۸۵۶ء)، خیر خواہِ پنجاب (۱۸۶۵ء) اور رفاہِ عام (۱۸۷۳ء)، جب کہ لاہور سے ہُمائے بے بہا (۱۸۵۳ء) اور ایک انگریزی اخبار *Punjabi Journal* جاری کیا۔ اِن میں سے چشمۂ فیض نے زیادہ شہرت پائی۔ یہ اخبار ۱۸۵۷ء کے بعد تک شائع ہوتا رہا۔ یہ حریت پسند اخبار تھا۔ اِس میں نظمیں اور غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ منشی دیوان چند کو اَدب کا بھی ذوق تھا، چنانچہ اُنھوں نے بلّھے شاہ کی پنجابی کافیوں کا اُردو ترجمہ بھی کیا جو گنجینۂ معرفت کے عنوان سے شائع ہوا۔[81] ڈاکٹر طاہر مسعود کے مطابق چشمۂ فیض کی ایک انفرادیت یہ تھی کہ اِس میں خبر کی سُرخیاں عام طور پر فارسی و اُردو اشعار، مصرعوں اور محاوروں، وغیرہ پر مشتمل ہوتیں۔[82] منشی دیوان چند کے اَدبی ذوق، چشمۂ فیض کے مشتملات میں اَدبی رنگ اور اِس کی اَدبی تخلیقات کی تفصیلات کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منشی دیوان چند کے اخبارات میں بڑی تعداد میں صحافتی اَدب شائع ہوا ہوگا۔ منشی دیوان چند کے اخبارات و جرائد کے صحافتی اَدب کو یوں بھی اہمیت حاصل ہے کہ اِس کا تعلق زیادہ تر پنجاب کے اُردو اَدب سے ہے اور ۱۸۷۰ء سے قبل پنجاب میں اُردو کی اَدبی اور مطبوعہ تخلیقات بہت کم ملتی ہیں۔ اِس تناظر میں منشی دیوان چند کے جاری کردہ اخبارات و جرائد کے اُردو صحافتی اَدب کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔

بمبئی سے ۱۸۵۵ء میں کشف الاخبار کا اِجرا ہوا۔ اس کے مدیر منشی امان علی لکھنوی تھے۔ اِس کے سرورق پر مشمولات کی تفصیل نظم میں بیان کی جاتی تھی، یعنی فہرستِ مضامین منظوم ہوتی تھی۔ اِس کے علاوہ اخبار سے متعلق ضروری قواعد بھی منظوم ہوتے تھے۔ اخبار میں خبروں کے علاوہ معلوماتی، تاریخی اور اَدبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے، غزلیں بھی درج ہوتی تھیں۔[83] اِس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشف الاخبار میں بھی صحافتی اَدب کافی تعداد میں مل سکتا ہے۔ یہ اخبار کم سے کم

۱۸۷۴ء تک جاری رہا۔[۸۴] گویا اِس کی زندگی کم و بیش بیس (۲۰) سال ضرور رہی ۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ۲۰ سال کے عرصے میں اِس اخبار میں کتنا صحافتی اَدب شائع ہوا ہوگا۔ اِس کے مدیر بھی لکھنوی تھے۔ اخبار کی فہرستِ مندرجات کا منظوم ہونا اُن کے صاحبِ ذوق اور شاعر ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ ایسے میں کشف الاخبار کے اَدبی مزاج اور اِس میں شائع ہونے والی اَدبی تخلیقات کی نوعیت، معیار اور مقدار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

لاہور سے پنجابی اخبار کا اِجرا ۱۸۵۵ء میں ہوا۔ اِس کے مالک اور مہتمم منشی محمد عظیم تھے۔ منشی صاحب پنجاب میں اُردو صحافت کی تیسری بڑی اور معروف شخصیت ہیں۔ پنجابی اخبار ۱۸۹۰ء تک جاری رہا۔ اِس طویل دورِ اشاعت میں اس کی ادارت مختلف اوقات میں محمد اکبر سیستانی خاورؔ، محمد مرادعلی خاں رعناؔ (شاگردِ غالبؔ)، میرا نورحسین ہماؔ، وغیرہ ہم جیسے اُدبا وشعرا کے ہاتھ میں رہی۔ اخبار میں اِن مدیروں کے علاوہ اُس دور میں پنجاب اور بیرونِ پنجاب کے ادیبوں اور خصوصاً شاعروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ اخبار کے کاتب بھی اپنے دور کے معروف ادیب و شاعر عمر دراز فائض تھے۔ اُن کی دو اُردو کتابیں فائض البیان اور فائض المعانی معروف ہیں جو اُس وقت کے نصاب میں پڑھائی جاتی تھیں۔ امداد صابری نے پنجابی اخبار سے میرانور حسین ہماؔ کے دو قطعاتِ تاریخ نقل کیے ہیں۔[۸۵] پنجابی اخبار کی طویل اشاعتی زندگی اور اِس کے مدیران و متعلقین کے اَدبی سروکار سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس اخبار سے بھی خاصی تعداد میں صحافتی اَدب برآمد ہوسکتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے ایک سال قبل اور اِلحاقِ اَوَدھ کے سال ۲۷ نومبر ۱۸۵۶ء کو دوشنبہ کے روز لکھنؤ سے ایک اہم اخبار سحرِ سامری جاری ہوا۔ یہ اخبار اِنتزاعِ سلطنتِ اَوَدھ کے بعد جاری ہوا اور اسے واجد علی شاہ اور مرحوم سلطنت اَوَدھ سے لگاؤ اور عقیدت تھی۔ اِس کے مہتمم اور غالبًا مالک بھی پنڈت بیج ناتھ تھے۔[۸۶] اِس اخبار کی زبان بھی طِلِسمِ لکھنؤ کی طرح اَدبی مزاج کی حامل تھی، اگرچہ طِلِسمِ لکھنؤ کی زبان اور بیان سے اِس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

سِحرِ سامری کے ابتدائی چار شمارے امیرؔ مینائی کی ادارت میں نکلے۔ اُن کے بعد رگھبیر نرائن عیّاشؔ اور خود پنڈت بیج ناتھ مدیر ہوئے اور آخر میں معروف شاعر شنکر دیال فرحتؔ اِس کے مدیر

رہے۔ اِس کے پہلے صفحے پر اخبار کا اشتہار اور قواعد منظوم ہوتے تھے۔[۸۷] اپنی زبان و بیان اور مواد کے لحاظ سے اور مدیران کی اَدبی شخصیت کی وجہ سے بھی، اندازہ ہے کہ اِس اخبار میں بھی خاصی تعداد میں صحافتی اَدب موجود ہوگا۔ اِس اخبار کے مدیران میں امیر احمد امیرؔ مینائی اور شنکر دیال فرحتؔ کی اَدبی حیثیت مسلّم ہے۔ دونوں معروف شاعر تھے۔ شنکر دیال فرحتؔ کامیاب مثنوی نگار تھے۔ رامائن کا منظوم اُردو ترجمہ اُن کا مشہور اَدبی کارنامہ ہے۔ اِن دونوں کے دورِ ادارت میں کتنی اَدبی تخلیقات سِحرِ سامری کی زینت بنی ہوں گی اور اخبار کی نثر میں کس طرح کا اَدبی رنگ پیدا ہوا ہوگا، اِس کا اندازہ باآسانی کیا جا سکتا ہے۔ نادر علی خاں اور محمد عتیق صدیقی کے مطابق سِحرِ سامری کا ایک فائل آزاد لائبریری، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے۔[۸۸] اِس کا تجزیاتی مطالعہ کر کے اِس میں شائع شدہ صحافتی اَدب کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔

حواشی و تعلیقات

* تحقیق کار، گرمانی مرکز زبان و ادب، لاہور یونی ورسٹی اوف مینجمنٹ سائنسز، لاہور۔

۱۔ رشید حسن خاں، ''اَدب اور صحافت''، مشمولہ اردو صحافت (سیمی نار کے مقالات)، مرتب انور علی دہلوی (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۵۹۔
یہ مجموعۂ مقالات اصلاً ''اُردو صحافت'' کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ سیمی نار میں پڑھا گیا۔ یہ سیمی نار اُردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام ۸ تا ۱۰ فروری ۱۹۸۶ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔

۲۔ اَدب کے پارکھ اِس جملے میں ''تضاد'' اور ''نسبت'' میں معنوی تعلق محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ''تضاد'' کے بیان میں دونوں الفاظ میں خود تضاد کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یوں عام جملے سے بڑھ کر اِس جملے میں اَدبی چاشنی پیدا ہوگئی ہے۔ اِس کے علاوہ اِس ایک جملے میں بلاغت بھی کمال کی ہے۔ اَدب اور صحافت میں تضاد تو ہے ہی لیکن بعض حیثیتوں میں اِن دونوں کے درمیان نسبت یا اشتراک کا رشتہ بھی موجود ہے۔ رشید حسن خاں نے یہاں یہ دونوں معنی مراد لیے ہیں۔ یوں اَدبی چاشنی اور بلاغت کی وجہ سے یہ جملہ رشید حسن خاں کے ذوقِ اَدب اور اُستادِ زبان ہونے کا ثبوت بھی ہے۔

۳۔ اِس طرح کی ایک کوشش پاکستان میں مُشفِق خواجہ مرحوم کی تحریک سے ہو چکی ہے۔ مُشفِق خواجہ کی راہ نمائی اور نگرانی میں مقتدرہ قومی زبان (اَب ادارۂ فروغِ اُردو زبان)، اسلام آباد نے ایک علمی و اَدبی منصوبہ ''اُردو رسائل کا سروے'' کے نام سے شروع کیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اُردو کے اَدبی رسائل کے مضامین کا جامع اشاریہ ترتیب دیا جائے۔ اِس منصوبے کا پہلا حصّہ اُردو رسائل کے سروے پر مشتمل تھا جس کے تحت پہلے پاکستان اور پھر بیرونِ پاکستان میں محفوظ اُردو کے اَدبی رسائل کی جامع اور اشاریاتی فہارس مرتب کی جاتیں۔ اِس پہلے حصے کا بھی پہلا حصہ کراچی کے کتب خانوں میں اُردو کے اَدبی

رسائل کے سروے پر مشتمل تھا۔ یہ منصوبہ تا حال شائع نہیں ہو سکا۔

۴۔ رشید حسن خاں، ص ۲۶۵۔

۵۔ ایضاً، ص ۲۶۱۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۶۵۔

۷۔ ابوالکلام قاسمی، ''اَدبی صحافت اور اَدبی رویے''، مشمولہ اردو صحافت: ماضی اور حال، مرتبین خالد محمود، سرور الہدیٰ (نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۲ء)، ص ۹۷۔

۸۔ ایضاً، ص ۹۷۔

۹۔ رشید حسن خاں، ص ۲۶۱۔

۱۰۔ ابو الکلام قاسمی، ص ۹۷۔

۱۱۔ رشید حسن خاں، ص ۲۶۵–۲۶۶۔

۱۲۔ ابو الکلام قاسمی، ص ۹۷۔

۱۳۔ رشید حسن خاں، ص ۲۶۰، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۶۰، ۲۶۱۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۶۵۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۶۲–۲۶۴۔

۱۷۔ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں (علی گڑھ: انجمن ترقی اُردو، ہند، ۱۹۵۷ء)، عکس اخبار، ص ۶۴–۶۵۔

۱۸۔ طاہر مسعود، اُردو صحافت اُنیسویں صدی میں (کراچی: فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۰۲ء)، ص ۶۰–۶۱۔

۱۹۔ گربچن چندن، جامِ جہاں نُما: اُردو صحافت کی ابتدا (نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ لمٹیڈ، ۱۹۹۲ء)، ص ۲۹، ۳۴؛ اِمداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اوّل (دہلی، ۱۹۵۳ء)، ص ۶۱؛ طاہر مسعود، ص ۱۳۰۔

۲۰۔ قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی کا راقم الحروف کے نام دعوتی خط، مورخہ ۴ دسمبر ۲۰۱۵ء، بہ موضوع:

"A Three Day World Urdu Conference on '200 Years of Urdu Journalism: Past, Present and Prospect', from 5 to 7 February 2016 at New Dehli."

۲۱۔ گربچن چندن، ص ۱۷۔

۲۲۔ مکمل حوالہ ''مآخذ'' میں ملاحظہ کیجیے۔

۲۳۔ قاضی عبدالغفار، ''اٹھارویں صدی کے دورِ ثانی کی صحافت اور اُس کے کچھ نمونے''، مشمولہ ماہنامہ ایشیا، میرٹھ (اگست ۱۹۴۲ء)، ص ۲۹۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۹–۳۰۔

۲۵۔ محمد عتیق صدیقی، صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۶۲ء)، ص ۲۴۔

۲۶۔ ایضاً،ص۲۶، ۲۷۔

۲۷۔ ایضاً،ص۳۰، ۳۱۔

۲۸۔ امداد صابری،''اُردو اخبارات و رسائل کا آغاز اور ان کی نوعیت''،مشمولہ روح صحافت (مجموعۂ مضامین)، از امداد صابری (دہلی: مکتبۂ شاہراہ، ۱۹۶۸ء)،ص۵۰۔

۲۹۔ ایضاً،ص۱۰۰۔

۳۰۔ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی،کمپنی کے عہد میں،ص۱۴-۱۵۔

۳۱۔ دیکھیے: امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد دوم،سوم، چہارم،پنجم کی فہارسِ مشمولات۔

۳۲۔ گربچن چند،ص۲۹، ۱۳۶؛ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلداول،ص۶۱-۶۲۔ (امدادِ صابری نے فارسی ذولسانی اخبار کا آغاز ۱۶مئی۱۸۲۲ء سے لکھا ہے۔ اخبار کی ہفتہ وار اشاعت کے حساب سے صحیح تاریخ ۱۵مئی ہی بنتی ہے)؛ طاہر مسعود،ص۱۳،۱۳۳۔

۳۳۔ گربچن چند،ص۹۱؛ طاہر مسعود،ص۱۳۴، ۱۳۸۔

۳۴۔ گربچن چند،ص۱۴۶-۱۴۷۔

۳۵۔ ایضاً،ص۱۴۹-۱۵۰۔

۳۶۔ ایضاً،ص۱۶۱،۱۶۲،۱۹۰، ۲۰۵۔

۳۷۔ ایضاً،ص۹۵-۱۰۲۔

۳۸۔ کتابوں کی تفصیل''مآخذ'' میں اور جامِ جہاں نُما کے اقتباسات کے لیے ان کتابوں کے متعلقہ صفحات ملاحظہ کیجیے۔

۳۹۔ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول،ص۱۲۲،۱۲۴، ۲۱۹۔

۴۰۔ محمد عتیق صدیقی، صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات،ص۱۰۰-۱۰۲۔

۴۱۔ خواجہ احمد فاروقی،''مقدمہ''،مشمولہ دہلی اردو اخبار ۱۸۴۱ء (نئی دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی،۲۰۱۰ء)، ص۳۴۹-۳۵۱۔

۴۲۔ ایضاً،ص۳۵۱۔

۴۳۔ ارتضٰی کریم (ترتیب وتہذیب)، دہلی اردو اخبار ۱۸۴۱ء (نئی دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی،۲۰۱۰ء)،ص۲۲۸، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۸۱۔

۴۴۔ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول،ص۱۲۷،۱۶۲-۱۶۴؛ طاہر مسعود،ص۱۹۳-۱۹۴۔

۴۵۔ محمد عتیق صدیقی، اٹھارہ سوستاون (۱۸۵۷ء): اخبار اور دستاویزیں (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء)، ص۴۳-۴۷؛ ارتضٰی کریم (ترتیب وتہذیب)، دہلی اردو اخبار ۱۸۵۷ء (نئی دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ۲۰۱۰ء)،ص ۴۷-۴۸۔

۴۶۔ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول،ص۲۲۲؛ محمد عتیق صدیقی، صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات،ص۱۰۳-۱۰۴ (حاشیہ)۔

۴۷۔ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول،ص۲۲۲-۲۲۴؛ محمد عتیق صدیقی، صوبۂ شمالی و مغربی کے

اخبارات و مطبوعات،ص۱۰۳–۱۰۴؛ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، حصہ اول (کان پور: نامی پریس، ۱۹۰۱ء)، ص۵۳–۵۴۔

۴۸۔ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص۵۴؛ حصہ دوم، ص ۳۹۷ و حاشیہ صفحہ ۳۹۷۔

۴۹۔ ضیاء الدین لاہوری، کتابیاتِ سر سیّد (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء)، ص۱۶–۱۹، ۸۴–۸۶، ۱۰۱۔

۵۰۔ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول، ص۲۲۴؛ نادر علی خاں، اُردو صحافت کی تاریخ: ۱۸۲۲ء – ۱۸۵۷ء (علی گڑھ، ناشر مصنف، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۲۸۔

۵۱۔ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول، ص۴۷۱–۴۷۲؛ محمد عتیق صدیقی، صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص ۱۲۶– ۱۲۷؛ طاہر مسعود، ص۲۵۷–۲۵۸۔

۵۲۔ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول، ص ۴۱۹۔

۵۳۔ ایضاً، صفحہ ۴۱۹، ۳۷۳۔

۵۴۔ طاہر مسعود، ص ۲۶۱– ۲۶۳۔

۵۵۔ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول، ص۳۷۳–۳۷۶۔

۵۶۔ ایضاً، ص۳۷۶– ۳۷۷۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۳۷۷۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۳۸۵، ۴۱۷۔

۵۹۔ نادر علی خاں، ص۲۹۶–۲۹۷۔

۶۰۔ محمد یعقوب فرنگی محلی (مدیر)، ''مقدمہ''، طلسم، لکھنؤ، ترتیب و تہذیب اقبال حسین (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۱۲ء)، ص vii؛ محمد رضا انصاری، ''ہفتہ وار طلسم لکھنؤ: ایک صدی پرانا اخبار''، ماہنامہ آج کل، نئی دہلی (جون ۱۹۵۱ء)، ص۴۰۔

۶۱۔ نادر علی خاں، ص ۳۵۹؛ محمد رضا انصاری، ص ۴۱۔

۶۲۔ محمد یعقوب فرنگی محلی، ص vii؛ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول، ص ۵۰۸–۵۱۰۔

۶۳۔ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول، ص۹۳–۹۴۔

۶۴۔ ایضاً، ص۲۳۵۔

۶۵۔ ایضاً، ص۲۳۳۔

۶۶۔ ایضاً، ص۲۳۲؛ محمد عتیق صدیقی، صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص۹۸–۹۹۔

۶۷۔ محمد عتیق صدیقی، صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص۹۹۔

۶۸۔ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول، ص ۲۴۱ – ۲۴۴۔

۶۹۔ نادر علی خاں، ص۱۳۵–۱۳۹۔

۷۰۔ امداد صابری، تاریخِ صحافتِ اُردو، جلد اول، ص ۲۴۵–۲۴۶؛ محمد عتیق صدیقی، صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص۱۱۳– ۱۱۴۔

۷۱۔ امداد صابری، تاریخِ صحافت اُردو، جلد اول، ص ۲۴۸۔

۷۲۔ نادر علی خاں، ص ۱۴۰۔

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۴۰۔ ۱۴۲۔

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۴۳۔۱۴۵؛ امداد صابری، تاریخِ صحافت اُردو، جلد اول، ص ۴۷۰۔۴۷۱۔

۷۵۔ امداد صابری، تاریخِ صحافت اُردو، جلد اول، ص ۴۸۴۔۴۸۵؛ محمد عتیق صدیقی، اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء): اخبار اور دستاویزیں، ص ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۳، ۱۷۴۔

۷۶۔ محمد عتیق صدیقی، اٹھارہ سوستاون (۱۸۵۷ء): اخبار اور دستاویزیں، ص ۱۲۹ ۔۱۳۶، ۱۵۹۔۱۶۵، ۱۸۶۔ ۱۹۴، ۲۰۵ ۔۲۱۱، ۲۲۲ ۔ ۲۲۵۔

۷۷۔ نادر علی خاں، ص ۱۵۲۔۱۵۵؛ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں، ص ۲۸۵۔۲۸۶۔

۷۸۔ نادر علی خاں، ص ۳۰۷۔۳۰۹۔

۷۹۔ طاہر مسعود، ص ۲۷۸۔

۸۰۔ محمد عتیق صدیق، صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص ۱۳۱۔

۸۱۔ امداد صابری، تاریخِ صحافت اُردو، جلد اول، ص ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۵۲، ۴۵۶، ۴۶۰؛ نادر علی خاں، ص ۳۲۹ ۔۳۳۰۔

۸۲۔ طاہر مسعود، ص ۲۸۶۔

۸۳۔ امداد صابری، تاریخِ صحافت اُردو، جلد اول، ص ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۹۔

۸۴۔ ایضاً، ص ۴۹۷۔

۸۵۔ ایضاً، ص ۵۰۲۔ ۵۰۳۔

۸۶۔ ایضاً، ص ۵۱۳؛ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ''آج سے ایک سو برس پہلے کے دو مشہور اخبار'' ہفت روزہ لیل و نہار، لاہور (۹ جون ۱۹۶۳ء)، ص ۹؛ طاہر مسعود، ص ۳۱۲۔

۸۷۔ طاہر مسعود، ص ۳۱۲۔ ۳۱۳؛ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ص ۹۔

۸۸۔ نادر علی خاں، ص ۲۹۷؛ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں، ص ۳۱۱۔

مآخذ

انصاری، محمد رضا۔ ''ہفتہ وار طلسم لکھنؤ: ایک صدی پرانا اخبار''۔ ماہنامہ آج کل، نئی دہلی (جون ۱۹۵۱ء)۔

پانی پتی، شیخ محمد اسماعیل۔ ''آج سے ایک سو برس پہلے کے دو مشہور اخبار'' ہفت روزہ لیل و نہار، لاہور (۹ جون ۱۹۶۳ء)۔

چندن، گربچن۔ جامِ جہاں نُما: اُردو صحافت کی ابتدا۔ نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۲ء۔

حالی، الطاف حسین۔ حیاتِ جاوید۔ کان پور: نامی پریس، ۱۹۰۱ء۔

خاں، رشید حسن۔ ''اَدب اور صحافت''۔ مشمولہ اُردو صحافت (سیمی نار کے مقالات)۔ مرتب انور علی دہلوی۔ دہلی: اُردو اکادمی، ۱۹۸۷ء۔

خاں، نادرعلی ۔اُردو صحافت کی تاریخ: ۱۸۲۲ء–۵۷ء۔علی گڑھ: ناشر مصنف،۱۹۸۷ء ۔
صابری، اِمداد ۔''اُردو اخبارات و رسائل کا آغاز اوران کی نوعیت'' ۔مشمولہ روحِ صحافت (مجموعہ مُضامین)۔از امدادصابری۔ دہلی: مکتبۂ شاہراہ،۱۹٦۸ء۔
__________۔ تاریخِ صحافتِ اُردو۔ جلد اول ۔ دہلی،۱۹۵۳ء۔
صدیقی، محمد عتیق (مرتب) ۔ اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء): اخبار اور دستاویزیں ۔ لاہور: مجلسِ ترقیِ اَدب، ۲۰۰۹ء۔
__________۔ صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات۔علی گڑھ : انجمنِ ترقی اُردو، ہند،۱۹٦۲ء۔
__________۔ ہندوستانی اخبار نویسی ، کمپنی کے عہد میں۔علی گڑھ: انجمنِ ترقی اُردو، ہند،۱۹۵۷ء۔
عبدالغفار، قاضی ۔''اٹھارویں صدی کے دورِ ثانی کی صحافت اور اُس کے کچھ نمونے'' ۔ماہنامہ ایشیا______، میرٹھ (اگست ۱۹۴۲ء): ص۲۹–۳۱۔
فاروقی، خواجہ احمد ۔''مقدمہ''۔مشمولہ دہلی اردو اخبار ۱۸۴۱ء۔نئی دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ۲۰۱۰ء۔
فرنگی محلی، محمد یعقوب (مدیر)۔''مقدمہ''۔ طلسم، لکھنؤ۔ترتیب وتہذیب اقبال حسین ۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان،۲۰۱۲ء۔
قاسمی، ابو الکلام۔'' اَدبی صحافت اور اَدبی رویے'' ۔مشمولہ اُردو صحافت: ماضی اور حال ۔مرتبین خالد محمود، سرورُ الہدیٰ۔نئی دہلی: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ،۲۰۱۲ء۔
کریم، ارتضیٰ (ترتیب وتہذیب)۔ دہلی اردو اخبار ۱۸۴۱ء۔نئی دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی،۲۰۱۰ء۔
__________۔ دہلی اردو اخبار ۱۸۵۷ء۔نئی دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی،۲۰۱۰ء۔
لاہوری، ضیاء الدین ۔ کتابیاتِ سر سیّد ۔ لاہور: مجلسِ ترقی اَدب، ۲۰۰۸ء۔
مسعود، طاہر۔ اُردو صحافت اُنیسویں صدی میں ۔ کراچی : فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ،۲۰۰۲ء۔